حسین شہید سہروردی

شورش کاشمیری

اشاعت اول

نومبر ۱۹٦۷ء

تعداد .... گیارہ سو
مطبع .... چٹان پرنٹنگ پریس
ناشر .... مطبوعات 'چٹان'، لاہور

قیمت تین روپے پچاس پیسے

گزارش

کتاب پڑھنے سے پہلے طباعت کی ان غلطیوں کو درست فرمالیں۔ کمپوزنگ میں بعض الفاظ رہ گئے ۔ بعض تصحیح کے باوجود چھوٹ گئے ، کچھ جگہ بلاضرورت سوالیہ نشان (؟) آ گیا ہے قلمزد کردیں اس اغلاط نامہ میں انہی الفاظ کی تصحیح کی گئی ہے جن سے مطالب مجروح ہوتے یا عبارت میں خلل واقع ہوتا ہے ۔ اس کے علاوہ کوئی لفظ کسی حرف کے چھوٹ جانے سے ٹوٹ گیا ہو یا عام سہو ہو تو اس کی صحت قارئین پر چھوڑ دی گئی ہے ۔

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	اغلاط	تصحیح
۲۳	آخری سطر	سکندر مرزا	سکندر مرزا اور ان کے حواری تھے جو
۲۷	سطر ۴	نسلاً بعد نسلاً	نسلاً بعد نسل
۳۳	سطر ۶	جانتے ہوئے کیوں	جانتے ہوئے آپ وہاں کیوں
۳۶	آخری سطر	مضمک	مضحک
۴۱	سطر ۱۹	وزارت	کلینسی وزارت
۴۱	سطر ۲۱	سنجیدہ تھے	سنجیدہ تھے اور
۶۰	سطر ۱۴	تو اس کے لیے	''لئے'' زائد ہے
۶۲	سطر ۱۲	ان کے ملٹری سیکرٹری	'ان کے' زائد ہے
۶۲	سطر ۱۵	انہیں گرمانی	اسے گرمانی
۶۲	آخری سطر	غالباً انہیں	اسے غالباً
۸۲	سطر ۱	جن زعماء نے	جن زعماء نے عوامی لیگ میں
۸۶	سطر ۱۱	انکار کیا	انکار نہیں
۱۰۰	سطر ۱۵	الگ کرالیں	الگ کر دیں
۱۲۰	سطر ۶	ملکوں میں تو اس نظام	ملکوں میں تو جمہوریت
۱۲۴	سطر ۴	کی تھی کی	کی تھی
۱۲۶	سطر ۷	چوتھا طبقہ ان منکرین	منکرین کی بجائے مفکرین

سر آغاز

پار سال میں انھی دنوں منٹگمری جیل میں تھا - تو میں نے یہ اوراق سپرد قلم کئے تھے - جب سے سہروردی صاحب کا انتقال ہوا - میں سوچ ہی رہا تھا کہ ان سے متعلق اپنے تاثرات لکھوں لیکن طبیعت یکسو نہ ہو سکی وقت گزرتا رہا - آخر ستمبر ۱۹۶۶ء میں قید و بند کا مرحلہ پیش آ گیا - ڈیفنس آف پاکستان رولز کی دفعہ ۳۲ کے ناجائز استعمال کا شکر گزار ہوں کہ اس نے مجھے یہ موقعہ فراہم کیا - نصف قید بیماری میں کٹ گئی نصف خامہ فرسائی میں -

میاں افتخار الدین کا خاکہ لکھا ، حمید نظامی پر قلم اٹھایا ، شہید سہروردی کے متعلق جو کچھ حافظہ میں تھا صفحہ کاغذ پر آ گیا -

عوامی لیگ کے خواجہ صدیق الحسن ان دنوں قید کے ساتھی تھے۔ انہوں نے زور دیا طبیعت آمادہ ہو گئی - دو ہفتوں میں یہ اوراق صبح شام کی یکسوئی سے مکمل ہو گئے - یہ بھی میرے بعض دوسرے شخصی مطالعوں کی طرح کا ایک شخصی مطالعہ ہے - لیکن اس مطالعہ میں سہروردی کی ایک بولتی چالتی تصویر ہے -

جو شخص ان کے سوانح و افکار پر قلم آٹھانا چاہے وہ تحقیق و جستجو کے سبھی راستوں سے گزر سکتا ہے - اس میں سہروردی کے سیاسی خطوط بھی ہیں اور عوامی نقوش بھی - یہ ایک قومی رہنما کے خدو خال کی تصویر ہے - اس کے مطالعہ سے آپ کو احساس ہوگا کہ آپ ایک ایسے سیاستدان سے ہم کلام ہیں جو محض سیاستدان ہی نہیں - اس کے علاوہ کچھ اور بھی تھا -

میں نے جو کچھ لکھا پوری ذمہ داری سے لکھا - حافظہ ٹھوکر کھا سکتا ہے لیکن جہاں تک کسی واقعہ کا تعلق ہے جو واقعہ بھی قلم سے نکلا اور جس مرحلہ میں پیش آیا اس کی صحت کو بہ کمال و تمام ملحوظ رکھا ہے - میں تاریخ میں افسانہ آرائی اور داستان سازی کو جرم سمجھتا ہوں -

رہ گئے اس مطالعے کے الفاظ تو میں نے حتی الامکان الفاظ کو ماپ تول کر لکھا ہے - اور کوشش یہی کی ہے کہ الفاظ میں اسراف و تبذیر سے کام نہ لوں - البتہ شخصی مطالعوں کے معاملہ میں میری یہ عادت رہی ہے کہ حقائق کی سنگینی کو الفاظ کی رنگینی میں چھپانے کی کوشش کرتا رہوں - یہ خوبی ایک ادیب میں ضرور ہونی

چاہیے کہ جو چیز بھی وہ کہنا چاہتا ہے اس کو اس طرح بیان کرے
کہ الفاظ انگشتری اور مطالب نگینے معلوم ہوں۔

ستائش کی تمنا ہی نہیں کہ طبیعت کا سانچہ اس سے مختلف بنا ہے رہی صلہ کی پروا تو قدرت نے بے نیاز رکھا ہے۔ عموماً انہی لوگوں کے سوانحی افکار یا سیرت کے برگ و بار پر قلم اٹھایا ہے جنہیں اقتدار کی سرد مہری یا انقلاب کی شوخ چشمی نے طاق نسیاں پر رکھا۔ اغماض کی بھینٹ چڑھایا یا پھر ان کے سروں سے کلاہ فضیلت اتار کر اجھلوں کی معرفت ان کی رسوائی کا سامان پیدا کیا

سہروردی ابھی تک اسی شیوۂ بے اعتنائی کا شکار ہیں جتنا کام انہوں نے پاکستان کے لئے کیا اس کی نسبت سے اعتراف تو ایک طرف رہا اقرار بھی نہیں ہوا۔ کبھی کبھار کوئی بھولی بسری یاد شاہراہ تاریخ سے ہٹی ہوئی سننے میں آ جاتی ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ مرحوم کو میں نے جس طرح دیکھا، پڑھا، پرکھا اور ان سے سیکھا وہ سب ایک تاریخی امانت ہے۔ جو بہر حال مجھے ملک کے حوالے کرنی چاہیے۔ کیونکہ جن لوگوں سے ملک متاثر ہوتا ہے ان کے سوانح و افکار ملک ہی کا ورثہ ہوتے ہیں۔

پاکستان میں تاریخ غیر معمولی حادثوں کی زد میں ہے صورت حال یہ ہے کہ یہاں جو لوگ عصا کے زور پر تاریخ لکھ رہے ہیں۔ قلم ان سے خوف زدہ ہیں۔ جو لوگ تاریخ کی حنا بندی پر مامور ہیں ان کے متعلق کچھ کہنے سے کچھ نہ کہنا بہتر ہے۔ تیسرا

گروہ ان لوگوں کا ہے جو فی نفسہ تاریخ کے ایک خاص دور کو بگاڑتے یا بناتے رہے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ ان کے طے شدہ دماغوں سے طے شدہ باتیں ہی نکل سکتی ہیں ۔ ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ اپنے بارے میں ان کا تجزیہ صحیح ہوگا ۔

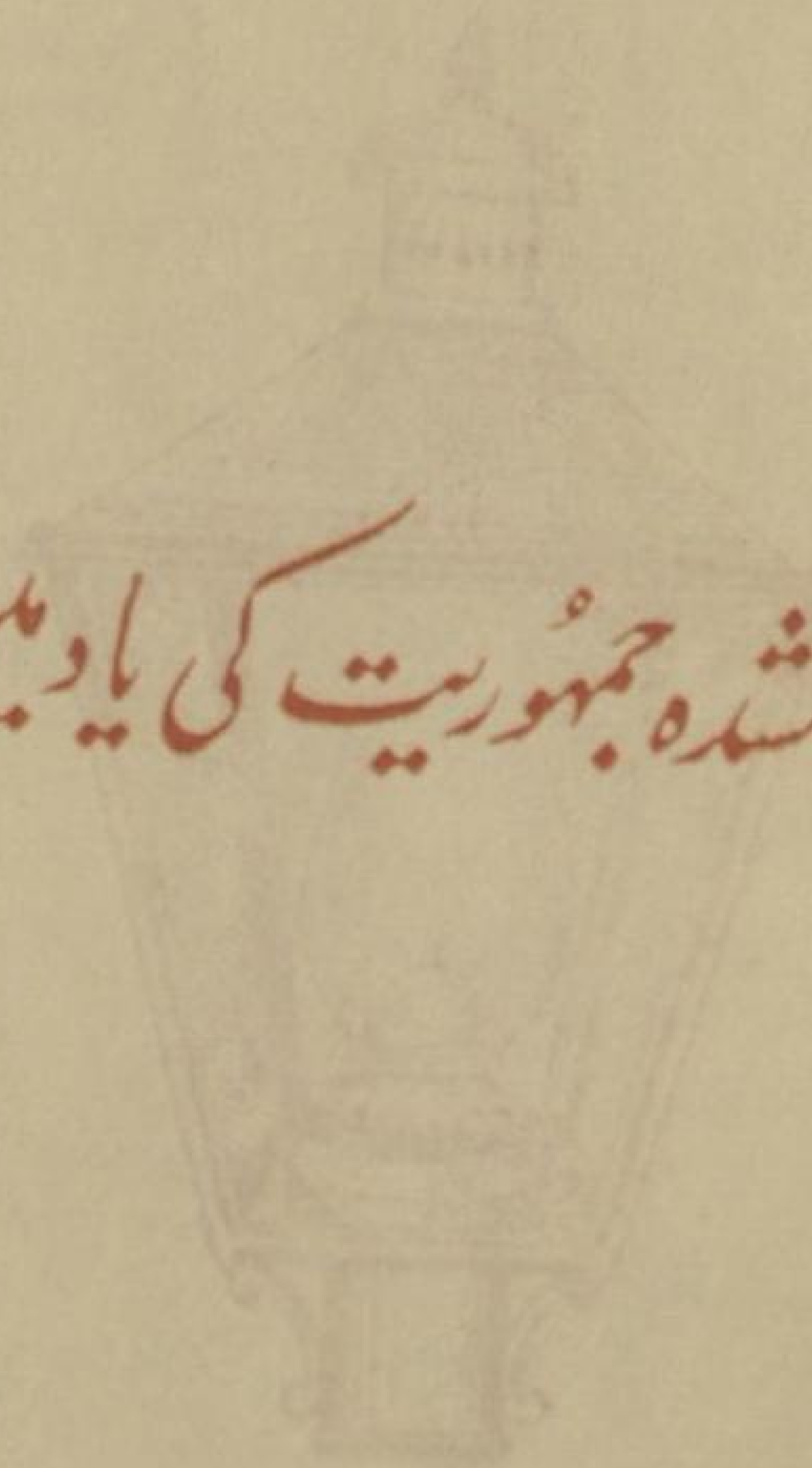
یہ کتاب اس لحاظ سے بھی مطالعہ کی چیز ہے کہ جس شخصیت کے بارے میں ہے وہ دنیا میں موجود نہیں لیکن کتاب میں موجود ہے۔ اور اس کو جس طرح موجود ہونا چاہیے تھا اسی طرح موجود ہے ۔

مسودہ کو دیکھا تو خوشی ہوئی کہ تاریخی حقیقتیں بھی تحریر میں آگئی ہیں تفصیل نہ سہی اجمال ہی سہی اور اجمال پوری داستان فراہم کرنے میں معاون ہو سکتا ہے ہر اشارہ اپنی جگہ صاف اور ہر کنایہ اپنی جگہ مکمل ہے ۔

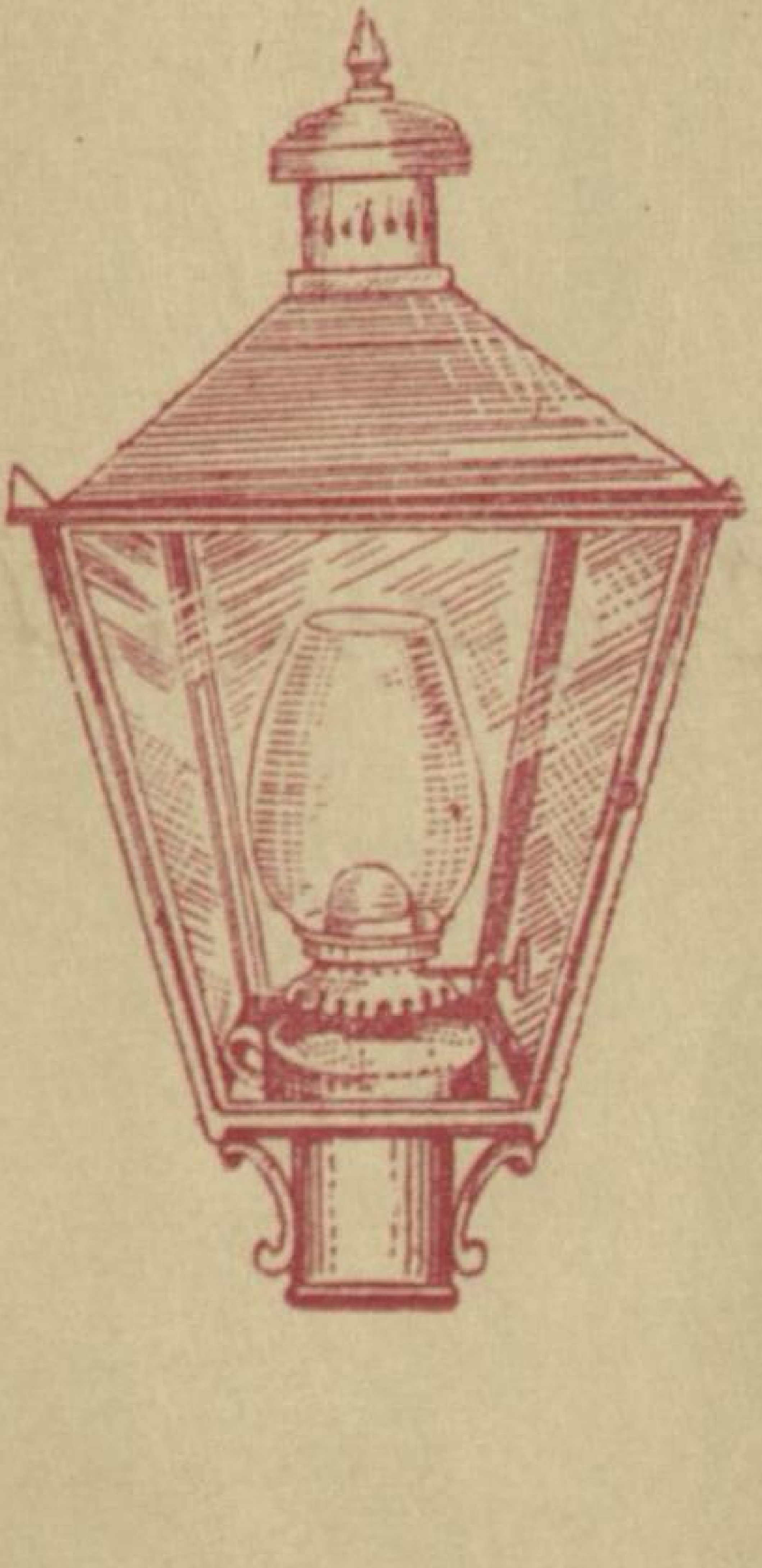
۲۲ اکتوبر ۱۹۶۷ء　　　　　　شورش کاشمیری



مصنف
اور
سہروردی



گمشدہ جمہوریت کی یاد میں



مطبوعاتِ چٹان لمیٹڈ

۸۸- میکلوڈ روڈ، لاہور

حسین شہید سہروردی

یہ نظم اس زمانہ میں ہدیہ سپاس کے طور پر لکھی گئی جن دنوں فیض احمد فیض راولپنڈی کے مقدمۂ سازش میں ماخوز تھے اور حسین شہید سہروردی اس مقدمہ میں صفائی کے وکیل تھے

کس طرح بیان ہو ترا پیرایۂ تقریر
گویا سر باطل پہ چمکنے لگی شمشیر

وہ زور ہے ، اک لفظ ادھر نطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہوئے تیر

گرمی بھی ہے ، ٹھنڈک بھی ، روانی بھی ، سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہئیے ، ہے تاثیر ہی تاثیر

اعجاز اسی کا ہے کہ ارباب ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر

اطراف وطن میں ہوا حق بات کا شہرہ
ہر ایک جگہ ، مکر و ریا کی ہوئی تشہیر

روشن ہوئے امید سے رخ اہل وفا کے
پیشانی اعدا پہ سیاہی ہوئی تحریر

○

حریت آدم کی رہ سخت کے راہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیال دم تعزیر

کچھ ننگ نہیں رنج اسیری ، کہ پرانا
مردان صفا کیش سے ہے رشتۂ زنجیر

کب دبدبۂ جبر سے دبتے ہیں کہ جن کے
ایمان و یقیں دل میں کئے رہتے ہیں تنویر

معلوم ہے اس کو کہ رہا ہوگی کسی دن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر

آخر کو سرافراز ہوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جور کی تعمیر

ہر دور میں سر ہوتے ہیں قصر جم و دارا
ہر عہد میں دیوار ستم ہوتی ہے تسخیر

ہر دور میں ملعون ، شقاوت ہے شمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانیٔ شبیر

O

کرتا ہے قلم اپنے لب و نطق کی تطہیر
پہنچی ہے سر حرف دعا اب مری تحریر

ہر کام میں برکت ہو ، ہر اک عزم میں قوت
ہر گام پہ ہو ، منزل مقصود قدم گیر

ہر لحظہ ترا طالع اقبال سوا ہو
ہر لحظہ مددگار ہو تدبیر کی تقدیر

ہر بات ہو مقبول ہر اک بول ہو بالا
کچھ اور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر

ہر دن ہو ترا لطف زباں اور زیادہ
اللہ کرے زور بیاں اور زیادہ

فیض احمد فیض

دسمبر ۱۹۵٦ء



اس کتاب کے بنگالی اور انگریزی

ایڈیشن بھی زیر طباعت ہیں

حُسین

شہید

سُہروردی

پروفیسر

رشید احمد صدیقی ــــ اُردو کے ادیب طناز نے مولانا محمد علی کے متعلق لکھا ہے کہ ان کی ولادت تو مادر زاد تھی لیکن موت خانہ زاد۔ اس کا ہو بہو اطلاق تو سہروردی پر نہیں ہوتا لیکن ایک حد تک یہ کلمہ ان پر بھی صادق آتا ہے۔ مشرقی پاکستان میں پیدا ہوئے۔ قربان مغربی پاکستان پر ہو گئے ع

بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

میرا ان کا ساتھ دس بارہ سال رہا اور ساتھ بھی ایسا کہ لغت کے الفاظ اس کا احاطہ ہی نہیں کر سکتے۔ ہر رخ سے انہیں دیکھا۔ پرکھا، تولا، ماپا، جانچا، وہ ایک کھلی کتاب تھے۔ انہیں پڑھنا مشکل نہیں تھا۔ ہر شخص اوراق میں گھوم پھر سکتا تھا۔ لیکن شرط قاری کا اپنا ذوق تھا جو لوگ بلندیوں پہ تھے انہیں بلند

دیکھتے - جو پستیوں میں تھے انہیں پست دیکھتے - ان کا وجود ایک چراغ تھا - جس سے روشنی بھی نکلتی ہے اور آگ بھی - اس کا انحصار انسان کے اپنے میلان طبیعت پر ہے - کہ وہ اس سے روشنی پاتا یا آگ بھڑکاتا ہے - وہ زندگی اور اس کی حقیقتوں کو بخوبی سمجھتے تھے - انہیں معلوم تھا کہ جس سانچہ میں وہ ڈھلے ہیں اس کے مطابق زندگی کیونکر بسر کی جاتی ہے - وہ ان لوگوں کی طرح نہیں تھے - جنہیں زندگی بسر کرتی ہے - وہ زندگی کو گذارتے تھے - انہیں معلوم تھا کہ ''زندگی نہ بجھ جانے کا نام ہے نہ بھڑک اٹھنے کا بلکہ زندگی نام ہے سلگتے رہنے کا'' وہ معاشرہ کی ہر جماعت میں رہ سکتے اور اکثر و بیشتر رہ چکے تھے - انہوں نے سبھی قسم کے دور دیکھے اور ہر قسم کے لوگوں سے میل جول رکھا - بادشاہوں کے مہمان ہوئے اُن کی میزبانی بھی کی - متحدہ ہندوستان میں ملک کے سب سے بڑے صوبے بنگال کے وزیر اعلیٰ رہے - ملک آزاد ہوا تو حزب اختلاف کے قائد ہو گئے - پھر وزارت عظمیٰ کا تاج پہنا - سکندر میرزا کی سازش کا شکار ہو کر باہر نکلے تو معاً بھول گئے کہ ابھی کچھ دیر پہلے وزیر اعظم تھے - وہ زندگی کو روگ لگانے یا کسی شے کے کھو جانے پر سوگ منانے کے سرے سے قائل ہی نہ تھے - اپنے دماغ کو حالات کے مطابق ڈھالنا اور اپنے دل کو سیلاب کی رو میں بھی خوش رکھنا اُن کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا - مارشل لاء کی حکومت نے اُنہیں قید کیا - وہ قید ہو گئے اقبال و زوال کی ہر گھاٹی عبور کر چکے تھے - اس بارے میں کسی ملال و خیال کے

عادی نہ تھے۔

ان کے مقابلہ میں دوسرے لوگ حکمرانوں کے داؤں پیچ بہت کم جانتے تھے۔ سیاستدانوں میں اُن کے جوڑ کا ایک بھی نہیں تھا۔ لیکن ان کی سطح اپنے حریفوں سے کہیں بلند تھی وہ پیچھے سے وار کرنا جانتے ہی نہیں تھے۔ کھل کے لڑتے اور ڈٹ کے کھیلتے تھے۔ ان میں ایک عالمانہ شان تھی۔ اس کا اظہار اس وقت ہوتا جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے اور صفحوں کے صفحے لکھ ڈالتے یا پھر جب وہ عدالت یا پبلک میں تقریر کرتے تو ان کے الفاظ کا تسلسل، مطالب کا عمق، افکار کی سچائی، خیالات کا نکھار اور اسلوب کا بانکپن پھٹا پڑتا۔ الفاظ کے جوہری اور معانی کے شہسوار تھے۔ بنگال کا جادو مشہور ہے۔ راقم کو اس کا تجربہ نہیں۔ لیکن سہروردی واقعی بنگال کا جادو تھے۔ بنگال کے لوگ اُن کے نام پر اس طرح اکٹھے ہوتے جس طرح شمع کے گرد پتنگے جمع ہوتے ہیں۔ نذرالاسلام کی زبان میں وہ کیسی تقریر کرتے تھے خود نہیں سنا لوگوں سے سنا ہے کہ دلوں میں اُتر جاتے تھے۔

اُردو میں تذکیر و تانیث کی ٹھوکر ضرور کھاتے لیکن مسلسل تقریریں کرنے کے بعد اتنی استعداد ضرور بہم پہنچا لی تھی کہ میر و غالب اور اقبال و ظفر علیخاں کی اس زبان کے شناسا ہو گئے تھے۔ خود اہل زبان اور خطابت کے بعض ہزار داستاں ان کا لگا ہی نہیں کھا سکتے تھے۔ انگریزی تو ان کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی تھی۔ جسٹس منیر اور بعض دوسرے جج محض ان کی لذت

تقریر کا لطف لینے کے لئے انہیں چھیڑ دیتے ۔ وہ انگریزی اس طرح بولتے تھے جس طرح بہار میں پھول کھلتے ہیں اور لکھتے اس طرح تھے جس طرح مغلوں کے عہد میں مینا بازار ؟ انگریزی بول چال میں کسی کو خاطر میں نہ لاتے۔ انہیں اپنی زبان دانی پر فخر و ناز تھا۔ وہ اپنے سے بڑا صرف اپنے بھائی شاہد سہروردی کو مانتے جو آکسفورڈ میں انگلش لٹریچر کے پروفیسر رہ چکے تھے ۔ یا پھر اپنی پھپھیری بہن شائستہ سہروردی کی تعریف کرتے ۔ ایک دفعہ فرمایا کہ مجھ سے زیادہ انگریزی صرف وہی جانتی ہے ۔

یہ تو خیر زبان و بیان کا حال تھا یا ان کی سیاسی شخصیت کا عکس۔ اس کے علاوہ بھی وہ مجموعہ صفات تھے ۔ اُن میں قوس قزح کے رنگ تھے ۔ وہ کہکشاں کی طرح کئی خطوط کا مرقع تھے ۔ شاعری کا فہم اور ادب کا ذوق ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کئے ہوئے تھا ۔ سماع سے انہیں حد درجہ لگاؤ تھا۔ قوالی بڑے اہتمام سے سنتے ۔ فارسی کلام کو ترجیح دیتے ۔ باقاعدہ نذر گزارتے — فرماتے سہروردی ہوں بزرگان چشت سے علاقہ رکھتا ہوں۔ سماع خاندانی ورثہ ہے۔ سیاست تو یہ تیسری پشت سے پیشہٴ آباً ہے ۔ سماع اسلاف کی میراث ہے ۔ راگوں اور راگنیوں کی نبضوں کو پہچانتے تھے ۔ جہاں تہاں قوال بے سرا ہوتا ٹوک دیتے ۔ الفاظ کے زیر و بم پر نگاہ رکھتے ۔ اچھی گوہ لگانے کے شائق تھے ۔ برجستہ اشعار سن کر پھڑک اٹھتے۔ مجلس سماع میں اس طرح بیٹھتے جس طرح کوئی سجادہ نشین بیٹھا ہو ۔ سماع کے آداب ملحوظ رکھتے ۔ جب

کسی فرد کو وجد و سرور ہوتا تو اس کا احترام کرتے۔ امیر خسرو کا کلام بہت پسند کرتے ۔ ایک دفعہ راقم الحروف کے ہاں محفل سماع میں امیر خسرو کے اس شعر پر دیر تک سر دھنتے رہے ۔ ۔ ۔ ۔

جفا کم کن کہ فردا روز محشر
بہ پیش عاشقاں شرمندہ باشی

ایک ادیب کے الفاظ میں ان کی کمزوریاں ایک اچھے شعر کی کمزوریاں تھیں اور ان کی خوبیاں تو بہر حال خوبیاں ہی تھیں ، وہ انسانی زندگی کو چھپانے کے قائل نہ تھے ۔ ان کا عقیدہ تھا کہ زندگی کی حقیقتوں پر پردہ ڈالنا اس کی گھٹن کو تیز کرنا ہے۔ وہ اخفا کو عماموں کا مذہب اور تصنع کو عباؤں کا مسلک گردانتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ دنیا زاہدوں اور عابدوں سے زندہ رہتی ہے ۔ لیکن اس کے بنانے اور سنوارنے یا اُٹھانے اور اُجالنے میں رندوں اور شاعروں کا بھی حصہ ہے ۔ وہ کہا کرتے تھے کہ زندگی میں حسن و غنا شریک نہ ہوں تو یبوست بڑھ جاتی ہے اور زندگی کا اور چھور ایک ویرانہ ہو جاتا ہے ۔ اس سے بیابان نوردی بہتر ہے۔ لیکن آبلہ پائی کے مزے بھی تلووں کے سہلانے سے آتے ہیں ۔ ان کے نزدیک خوبصورت چہرے قدرت کا عطیہ تھے اور خوبصورت آوازیں فطرت کی سوغات ۔ جن سے روح کو بالیدگی اور دل کو اہتزاز حاصل ہوتا ہے - یہی وجہ تھی کہ سیاسیات کے ذہنی پتھراؤ سے جب ان کے دل و دماغ مجروح ہوتے تو عمر رفتہ کو آواز دینے کے

لئے "غزل اس نے چھیڑی مجھے ساز دینا" کی گلگشت کو نکل جاتے کئی دوستوں کے ہاں آواز خوش کی محفلیں ہوتی تھیں ۔ اکثر شریک ہوتے اور حظ اٹھاتے تھے۔ ایک دفعہ راوی کے کنارے بارہ دری کی چھت پر رات بھر محفل لگی رہی، چند بے تکلف دوستوں نے ایک بڑے سے بجرے میں چراغ روشن کیا ۔ غالب کی غزل چھڑ گئی ۔

مدت ہوئی ہے یار کو مہماں کئے ہوئے
جوش قدح سے بزم چراغاں کئے ہوئے
پھر پرسش جراحت دل کو چلا ہے عشق
سامان صد ہزار نمکداں کئے ہوئے
دل پھر طواف کوئے ملامت کو جائے ہے
پندار کا صنم کدہ ویراں کئے ہوئے
پھر جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیر بار منت درباں کئے ہوئے
جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے

دوستوں کا حال یہ تھا کہ لوٹ پوٹ ہوگئے۔ ہر شعر، ساز و آواز سے دوآتشہ ۔ سہروردی تو ان اشعار میں گھلے جا رہے تھے ۔ پانچواں شعر صرف ان کی جیب ہی سے دو سو روپیہ لے گیا ۔

غالب نے یونہی نہیں کہا تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

ڈھونڈھے ہے اس مغنیٔ آتش نفس کو جی
جس کی صدا ہو جلوۂ برق فنا مجھے

بعض تھڑ دلے اُن کی اس فیاض طبیعت کے باعث مصرع طرح اُٹھاتے اور اس پر گرہ لگاتے تھے۔ چنانچہ آج تک خود ساختہ روایتوں اور خانہ ساز حکایتوں کا انبار چلا آ رہا ہے۔ ع

لوگ نالے کو رسا باندھتے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ وہ معصیتوں سے بہت بالا تھے۔ انہیں اپنی تر دامنی پر ناز نہیں تھا اور نہ وہ فرشتوں کو وضو کی دعوت دیتے تھے۔ جوانی انہوں نے بھی گذاری تھی یہ کہیئے کہ جوانی ان پر بھی گذری تھی مگر پاکستان میں وہ اس بادل کی طرح تھے جو برس چکا ہو۔ زیادہ سے زیادہ وہ اس پکے راگ کا نقطۂ عروج تھے جس میں ساز کے بے رنگ ہونے سے کبھی کبھار خم آ جاتا ہے ان کا نفس آوارہ نہیں تھا۔ پان شوق سے کھاتے سگریٹ کا بھی کبھی کبھار شوق فرما لیتے تھے۔ ان کے خلاف لہو و لعب کی جو کہانیاں پھیلی ہوئی تھیں وہ پھیلائی گئی تھیں۔ ان کا پس منظر سیاسی تھا اور مقصود رسوائی۔ تماشا یہ تھا کہ جو لوگ ان کے خلاف اس قسم کی باتوں کو ہوا دیتے وہ خود اس کوچہ و بازار کے حراف تھے۔ سکندر میرزا کے عہد میں سب سے زیادہ ان باتوں کا چرچا کیا گیا۔ خود سکندر میرزا نے ان کے رقص کی ایک غیر ملکی تصویر اخباروں کو بھجوائی۔ ان کی وزارت عظمیٰ کے دوران بھی یہی پتنگیں اُڑتی رہیں۔ وہ الگ ہوگئے۔ تو اسی قسم کے کنکوے اڑائے گئے اور انہیں بالا التزام ڈور پلائی گئی لیکن جو لوگ ان تکلوں کو بڑھاتے تھے وہ سکندر میرزا شرف انسانی و مجد

کی اہانت کے مجرم تھے ۔ یہ ایک الگ بات ہے کہ ان رسوائیوں کو ڈور پلانے میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے جو فی نفسہ شریف انسان تھے لیکن ان کی زبانیں حریفانہ چشمک میں کترنی کی طرح چلتی تھیں ۔

ادھر سہروردی کے ظرف کا یہ حال تھا کہ وہ ان باتوں کی رسید ہی نہ دیتے ۔ بلکہ اپنی بے سری آواز میں شاد عظیم آبادی کا یہ شعر پڑھ کر خوش ہو لیتے - - - - - - - -

کئے جاؤ سے خوارو کام اپنا اپنا
سبو اپنا اپنا ہے جام اپنا اپنا

اپنے کسی حریف کے بارے میں نہ تو وہ اس قسم کی زبان استعمال کرتے اور نہ اس کے دامن میں گرد و غبار ڈالتے ۔ فرماتے کہ انسان اپنے خیالات کا عکس ہوتا ہے ۔ جس قسم کے افکار و افعال انسانوں میں ہوتے ہیں وہ اسی قسم کی باتیں کرتے اور اسی نہج پر دوسروں کے متعلق سوچتے ہیں ۔

ایک دفعہ دوستوں نے عرض کیا - ان شبینہ محفلوں سے اجتناب کیا کریں ان میں کیا رکھا ہے ؟ بلا وجہ رسوائی ہے ۔
کہنے لگے ۔

"تم لوگ عجیب باتیں کرتے ہو ۔ خوف انسان کو بچا نہیں سکتا ۔ فطرت انسانی بڑی بے ڈھب واقع ہوئی ہے ۔ اس کو انسانی گوشت کھانے کا چسکہ لگا ہوا ہے ۔ میں دن بھر کی محنت کے

بعد اگر گھنٹہ دو گھنٹہ سیر و تفریح میں گزارتا ہوں تو اس میں عیب کیا ہے ؟ کیا تمام رسوائیاں میرے ہی لئے رہ گئی ہیں - پاکستان میں باقی سبھی لوگ پیغمبروں کی زندگی گذار رہے ہیں ؟

یہاں پہنچ کر وہ تھوڑا سا جھنجھلا گئے -

"جس چیز کو میں نے عمر بھر ترک نہیں کیا اس کو صرف اس لئے چھوڑ دوں کہ یہاں بعض لوگوں کی زبانیں بے قابو ہو گئی ہیں ـــــ نا ممکن ہے -"

ملک کے سیاستدانوں میں وہ سب سے پرانے سیاستدان تھے - خان لیاقت علی خان بھی ان سے پیچھے تھے- ان سے بہت پہلے وہ سیاسیات میں قدم رکھ چکے تھے - جو لوگ پہلی وزارت سے لے کر ان کے انتقال تک پاکستان میں حکمران رہے وہ (الا ماشا اللہ) ان سب کے پیشرو تھے - لیکن بعض لوگ تو ان کے سامنے طفل دبستان کی حیثیت رکھتے تھے - مرحوم پنجاب کے نوجوان راہنماؤں کا ان کے مقابلہ میں کوئی سیاسی تجربہ نہ تھا - سرحد کے لیگی راہنماؤں کا بھی یہی حال تھا - سندھ کا معاملہ بھی قریب قریب یہی رہا - تحریک خلافت کے کچھ لوگ موجود تھے- تو وہ ان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں سے بہت پیچھے تھے- بلوچستان میں تو خیر شروع ہی سے سناٹا رہا - کراچی میں یو پی اور مرحوم دہلی وغیرہ کے مہاجر آباد تھے - لیکن ان میں بھی ایک دو کو چھوڑ کر کوئی شخص ان

کے درجہ کا نہ تھا ۔ چودھری خلیق الزمان معمر ضرور تھے اور کبھی ان کا شمار مسلمانوں کے برگزیدہ راہنماؤں میں ہوتا تھا مگر کسی عملی سیاست کے اہل نہ رہے تھے۔ فرمانروا جماعت اور اس کے اعوان و انصار میں خواجہ ناظم الدین البتہ ان سے بڑے تھے اور سہروردی ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ لیکن تواتر و تسلسل کے ساتھ خالص سیاسی زندگی ان کی بھی نہ تھی۔ چودھری ظفر اللہ خاں، ملک غلام محمد، چودھری محمد علی، میاں مشتاق احمد گرمانی لاکھ فہیم و زیرک سہی لیکن وہ سرکاری ''سیاستدانوں'' اور وزارتی ''راہنماؤں'' میں سے تھے۔ گویا خود آئے نہیں لائے گئے تھے البتہ سردار عبدالرب نشتر کے معاملہ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ بھی خلافت کی تحریک ہی میں نکلے تھے۔ سہروردی مولانا شوکت علی کے لاڈلے تھے۔ سردار عبدالرب نشتر کو مولانا محمد علی سے بے پناہ اُنس تھا ۔ اور ان کے متبع تھے لیکن نشتر سرحد میں وہ مقام نہیں رکھتے تھے جو مقام سہروردی کو بنگال میں حاصل تھا ۔ جہاں تک اعلیٰ انسانی صفات کا تعلق ہے نشتر مرحوم اُن کی تصویر تھے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ وہ قائد اعظم کے معتمد تھے۔ قائد اعظم نے وزارتی مشن سے گفتگو کے لئے مسلم لیگ کا جو سہ رکنی وفد ترتیب دیا تھا وہ اس میں تھے۔ پھر وہ قائد اعظم کی زندگی سے لے کر ملک غلام محمد کے انقلاب تک اقتدار میں رہے۔ اقتدار سے نکلے تو پاکستان مسلم لیگ کے صدر ہوگئے۔

سہروردی ان کی طرح قائد اعظم کے معتمد نہ تھے ۔ اور نہ کبھی انہیں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں لیا گیا ۔ اُس کے وجوہ

بھی تھے۔ پہلی وجہ تو ان کی انفرادیت اور بنگال کے بعض دوسرے راہنماؤں کا وجود تھا۔ دوسری وجہ وہی شخص سمجھ سکتا تھا جو ان کے ساتھ مسلسل رہا ہو اور جن پر ان کی طبیعت آشکار ہو۔ مثلاً ان میں سہروردی خاندان کی نسلاً بعد نسلاً بالا بلندی کا زبردست احساس موجود تھا۔ اور وہ اپنی اس برتری کو ایک لحظہ کے لئے بھی ترک کرنے کو تیار نہ تھے۔ یہی احساس ان کی آنا ہو گیا تھا۔ وہ خود رائے بھی تھے۔ ورکنگ کمیٹی کے بعض ارکان جو قائد اعظم سے زیادہ قریب تھے انہیں اپنے لئے کانٹا سمجھتے ان میں ایک منچلا پن تھا جو کئی راستوں سے آ کر ان کی ذات میں مرتکز ہو گیا تھا۔

سیاسی تنظیموں میں ہائی کمانڈ ہمیشہ اُن لوگوں پر مشتمل ہوتا ہے جن میں خیالات کی یکسانی ہو۔ جو مشترک خصوصیتیں رکھتے ہوں آپس میں کوئی نقطۂ وحدت ہو۔ اور مرکزی قیادت کے تابع ہوں۔ مجلس عاملہ عموماً یکرنگ افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہے۔

کانگریس ہندوستان کی عظیم ترین پولیٹیکل آرگنائزیشن تھی۔ گاندھی جی نے اس پر قبضہ کیا تو اس کی مجلس عاملہ کے ارکان میں وہی لوگ رہے جو آپس میں نا گزیر اور بنیادی امور میں متفق تھے۔ گاندھی جی نے اپنے اثر سے باہر کے کسی فرد کو مجلس عاملہ میں رہنے نہ دیا۔ ان کی زندگی میں کوئی ایسا شخص کانگریس کا صدر نہ ہو سکا جو ان کی سرپرستی سے الگ رہا ہو یا جس کے بارے میں وہ سمجھتے ہوں کہ یہ ان سے انحراف کر سکتا اور اختلاف رچا سکتا

ہے۔ لطف یہ ہے کہ لاہور کانگریس کے بعد گاندھی جی کانگریس میں چار آنے کے بھی ممبر نہ رہے لیکن کانگریس بہر حال اُن کی قیادت کا نام تھا۔ کانگریس کو حکومت سے لڑنا ہوتا تو وہ سبھی کچھ ان کے سپرد کر دیتی تھی۔ سبھاش چندر بوس کو گاندھی جی سے بغاوت کی سزا ملی۔ وہ کانگریس کے صدر منتخب ہو کر بھی کانگریس کے صدر نہ رہ سکے۔ گاندھی جی کے نامزد اُمیدوار پٹا بھائی ستہ رامیہ صدارتی انتخاب ہار گئے تو گاندھی جی نے اُن کی ہار کو اپنی ہار کہا۔ خود تری پور کانگریس کے اجلاس میں شامل نہ ہوئے۔ بلکہ راجکوٹ میں برت رکھ کر سارے ملک کی توجہ اپنی طرف پھیر لی۔ سبھاش بابو اس وقت سخت بیمار تھے۔ اب تک جو مجلس عاملہ چلی آ رہی تھی اس کے ارکان نے سبھاش بابو کی مجلس عاملہ میں شامل ہونے سے انکار کر دیا نتیجۃً سبھاش بابو چار و ناچار استعفیٰ دے کر الگ ہو گئے اور فارورڈ بلاک کی بنیاد رکھی۔ مولانا ابو لکلام آزاد فرماتے تھے کہ بنگالی بہت عمدہ انقلابی ہوتے ہیں۔ لیکن اپنے صوبہ سے باہر کسی کے پیرو شاذ ہی ہوتے ہیں۔ اِلا اُن لوگوں کے جن کی اپنی کوئی طاقت نہ ہو یا ان کے پاؤں تلے کی مٹی مضبوط نہ ہو۔

قائد اعظم گاندھی جی سے بالکل مختلف تھے مثلاً وہ صرف سیاستدان تھے اور یہ بات بخوبی سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا مزاج کیا ہے۔ اُنہیں کیسے لیڈر چاہیں ؟ اور ایک سیاسی تنظیم کن لوگوں پر مشتمل ہو تو چل سکتی ہے۔ ہائی کمانڈ کی خصوصیت کیا ہونی

چاہئے۔ قائد اعظم اگلی پچھلی سیاسی تنظیموں اور ان کے عہد بعہد تجربوں سے بھی آگاہ تھے۔ جماعت عاملہ میں ہمیشہ انہی لوگوں کو شریک رکھا جو ان کے الفاظ کو آویزۂ گوش بناتے اور اُن کے احکام کو دل پر نقش کر لیتے تھے سہروردی کا خیال تھا شاید وہ مسلم لیگ کے سبھاش بابو ہو سکتے ہیں لیکن دونو تنظیموں کے مزاج میں فرق تھا۔ قائد اعظم کے وجود سے خارج کسی لیگی راہنما کی شخصیت کا تصور ہی نہ تھا۔ مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے بہت سے ارکان سہروردی کی قابلیت اور مقبولیت کا عشر عشیر بھی نہ تھے۔ وہ اُن لوگوں میں سے تھے جو کسی بھی جماعت کے لئے سرمایۂ فخر اور کسی بھی ملک کے لئے باعث توقیر ہوتے ہیں۔

پاکستان کیونکر بنا؟ یہ ایک الگ بحث ہے۔ تاریخ میں اس کے شواہد و نظائر موجود ہیں۔ لیکن تحریک پاکستان کے ایک خاص مرحلہ میں سہروردی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ قائداعظم نے دہلی کنونشن کے بعد جب پہلی دفعہ ڈائریکٹ ایکشن منانے کی ہدایات جاری کیں تو بنگال میں سہروردی تھے۔ جنہوں نے اس کی اہمیت کو محسوس کیا۔ وہ اس وقت صوبہ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کے قیام کا مطالبہ اس وقت جس مرحلے اور جس ولولے میں تھا اُس سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات میں اشتعال پیدا ہو گیا تھا۔ اس کا نتیجہ کلکتہ اور نواکھالی کے فسادات تھے۔ نواکھالی کا رد عمل بہار میں ہوا۔ پھر یہ آگ ملک بھر میں لگ گئی۔ سہروردی

کلکتہ کے فسادات کا واقعہ خود سناتے تھے کہ شیام پرشاد مکر جی نے کس طرح اس فساد کو منظم کیا اور مسلمانوں کو ہلاک کرنے کا منصوبہ بنایا - یہاں تک کہ مسلمانوں کو کلکتہ میں زندہ جلا ڈالا مسلمانوں کے متعلق وہ مولانا آزاد ہی کا ایک جملہ نقل کرتے تھے۔ کہ مسلمان بادلوں کی طرح اُٹھتے آندھی کی طرح چھا جاتے اور غبار کی طرح بیٹھ جاتے ہیں۔ ان کا بیان تھا کہ تحریک پاکستان میں مسلمانوں نے جس یک جہتی اور خود سپردگی کا ثبوت دیا وہ مسلم لیگ اور قائد اعظم کی بہت بڑی متاع تھا لیکن علیحدگی اور تقسیم کی زبردست تحریک کے باوجود مسلمان ان ناگزیر فسادات کی مدافعت سے غافل رہے۔ کلکتہ کے فسادات نے انہیں چوکنا کر دیا تھا - وہ سنگٹھنیوں کے ارادوں کو بھانپ گئے ان کے سامنے بہار کا المیہ آ چکا تھا - بہار میں جو کچھ ہوا وہ سارے ملک میں نہیں ہوا تھا - ان فسادات کے برگ و بار راقم نے بھی دیکھے تھے - قتل عام اس قدر بہیمانہ تھا کہ پناہ بخدا ! ہزاروں لڑکیاں اغوا کر لی گئیں - گاؤں کے گاؤں جلا دیئے گئے - جہاں تہاں مسلمانوں کا نشان تھا مٹا دیا گیا - املاک لوٹ لی گئیں - نوجوانوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا - بوڑھوں کے اعضا کاٹ دیئے گئے ، عورتوں کے پیٹ چاک کئے گئے - دوشیزاؤں کی عصمت دری کی گئی - مسجدوں کو آگ لگا دی گئی - پٹنہ ، مونگھیر اور گیا کے اضلاع اس تباہی کا گڑھ تھے - لوگ بہار کے ان اضلاع سے اُٹھ اُٹھ کے آسن سول جا رہے تھے - جو مغربی بنگال میں واقع تھا - یا پھر مختلف کیمپوں میں پڑے تھے اور ان کا کوئی پرسان حال نہ تھا - مسلم لیگ نے بہار ریلیف فنڈ

کے نام پر کوئی پنیتالیس لاکھ روپیہ جمع کیا۔ جو پاکستان میں منتقل ہو چکا اور اُنیس برس بعد بھی حبیب بنک میں پڑا ہے۔ اب اس روپیہ کو ایک قانون کے ذریعہ صدر مملکت کے اختیار میں دے دیا گیا ہے کہ اپنے صوابدید پر وہ اس کو خرچ کر سکتے ہیں۔

سہروردی نے کلکتہ پولیس میں مسلمانوں کا تناسب کمتر پایا اور دیکھا کہ مارواڑی سیٹھ اسلحہ کی خریداری اور جنگ کی تیاری میں روپیہ پانی کی طرح بہا رہے ہیں تو چپ چاپ پنجاب آ گئے اور یہاں کے دو سو نوجوان پولیس میں بھرتی کر کے کلکتہ لے گئے۔ ان نوجوانوں نے کلکتہ میں مسلمانوں کے تحفظ کا فرض انجام دیا۔ اور اس وقت تک مسلمانوں پر دوبارہ حملہ نہ ہونے دیا جب تک پاکستان نہیں بنا اور کلکتہ مغربی بنگال میں نہیں چلا گیا۔ ان پنجابی نوجوانوں کی بھرتی کے خلاف ہندو اخباروں نے بڑا شور مچایا۔ تقسیم ہوئی تو یہ نوجوان واپس آ گئے لیکن سہروردی مسلمانوں کی خانہ ویرانی کو روکنے کے لئے کلکتہ ہی میں ٹھہر گئے۔ انہوں نے گاندھی جی کی ہمراہی اختیار کی جو اُس وقت کلکتہ میں ''آزادی'' کے ان وحشیانہ مظاہر و آثار سے عوام کو روک رہے تھے۔ ہندوؤں نے ایک زبردست مظاہرہ میں گاندھی جی سے مطالبہ کیا کہ سہروردی کو ان کے حوالہ کریں؟ وہ ہندوؤں کے قاتل ہیں۔؟ گاندھی جی کہاں سپر انداز ہوتے؟ قیام گاہ کی بالکونی سے لوگوں کو خطاب کرتے ہوئے کہا

''میں تمہارے غصہ کا سبب سمجھتا ہوں۔ تم بھڑک رہے ہو

مجھے اس کی وجہ بھی معلوم ہے؟ لیکن غصہ سے کچھ نہیں بنے گا۔ اس سے اور خون خرابہ ہوگا۔ انسان قتل ہوں گے اور گاندھی انسانوں کے قتل میں حصہ نہیں لے سکتا۔ جن لوگوں نے قتل کیا یا قتل کروایا وہ خدا کی سزا سے نہیں بچ سکتے۔ اس کی عدالت سب سے بڑی عدالت ہے۔ تم خون کا بدلہ خون کے نعرے لگا کر ہندوستان کو بدنام کر رہے ہو۔ اس سے دیش کی دنیا بھر میں رسوائی ہو گی۔ جو شخص قتل کے بدلے قتل چاہتا ہے۔ اس میں اور ایک قاتل میں کیا فرق ہے؟ آپ لوگ ستیہ اور اہنسا کو اپنائیں۔ آخری جیت ستیہ اور اہنسا کی ہے۔ اگر مسلمانوں نے بے گناہوں کو مارا ہے تو اُس کا بدلہ بے گناہ مسلمانوں سے لینا مردانگی نہیں؟ دھرم کمزور کی حفاظت سکھاتا ہے۔ پرماتما کے نزدیک پرم دھرم یہی ہے کہ تم انسانی خون اور انسانی آبرو کی حفاظت کرو۔"

سہروردی کا بیان تھا کہ اشتعال کا زمانہ تھا ان حالات میں کہ سبھی کچھ ہو چکا تھا۔ سبھی کچھ ہو رہا تھا اور سبھی کچھ ہو سکتا تھا۔ گاندھی جی کے ان الفاظ کو اس وقت لوگوں نے خوش دلی سے قبول نہ کیا لیکن احتراماً خاموش ہو گئے۔ وہ لوگ گھات میں تھے کہ سہروردی کو قتل کریں۔ تعاقب بھی کیا۔ ایک دفعہ قاتلانہ حملہ بھی ہوا لیکن خطا گیا۔ جہاں گاندھی جی کے ساتھ سہروردی مقیم تھے وہاں جن سنگھیئے خنجر در آستیں پھرتے رہے لیکن داؤں نہ لگا ایک دفعہ ان پر بم پھینکا گیا اور وہ بال بال

بچ گئے۔

حیدر آباد (سندھ) میں جلسہ عام تھا۔ سہروردی مجھے ساتھ لے کر موٹر میں کراچی سے روانہ ہوئے تو میں نے راستہ میں یہی قصہ چھیڑ دیا۔

بابا ، (ہم انہیں احتراماً بابا کہتے تھے۔ گھر میں بھی انہیں بابا ہی کہا جاتا تھا) یہ سبھی کچھ جانتے ہوئے کیوں رہ گئے تھے ؟

میرا وہاں رہنا بہت ضروری تھا۔ تقسیم اتنی اچانک اور اتنی تھوڑی مدت میں ہوئی تھی کہ کلکتہ کے مسلمانوں کے لئے اتنی جلدی وہاں سے نکلنا بڑا مشکل تھا۔ ایک تو وہاں مسلمانوں کی بڑی بڑی جائیدادیں تھیں۔ دوسرا ان کے سامنے کوئی صاف راستہ نہ تھا کہ جائیں کہاں ؟ بے ٹھکانہ چلنا کوئی ہوشمندی نہ تھی۔ تیسرا وہ لاکھوں غریب مسلمان تھے جنہوں نے پاکستان کی جد و جہد میں سب کچھ لٹا کر اپنا مستقبل بھی کھو دیا تھا۔ ان کے لئے مہاجر ہونا بھی مشکل تھا۔ دولت ان کے پاس کہاں ؟ عزت تھی اور اس کے لئے سخت خطرہ تھا۔ میں بنگالی سنگھٹینوں کی فطرت کو جانتا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ آتشزنی ، لوٹ مار اور اغوا سے ان سب کو ٹھکانے لگا دیں گے۔ سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ یو پی کے بعض گھاگ جن سنگھی اور بہار کے آزمودہ آتشزن کلکتہ پہنچ چکے تھے۔ اور وہ تہیہ کئے ہوئے تھے کہ کلکتہ سے مسلمانوں کے

بچہ بچہ کا خاتمہ کر دیں گے - بڑے لوگ تقریباً سبھی پرواز کر کے کراچی جا چکے تھے- میں نے سوچا ان لوگوں کو جو اس وقت بالکل ہی بے سہارا ہیں تنہا چھوڑ کر میں بھی بھاگ گیا تو ان پر جو بیتے گی وہ ظاہر ہے آخر ایک روز مجھے خدا کے سامنے پیش ہونا ہے- ہم نے انہیں پاکستان کے لئے آمادہ کیا تھا اس کا مطلب یہ نہیں کہ پاکستان بن جائے تو ہم انہیں ہندوستان میں چھوڑ کر خود پاکستان کے ہو جائیں اور صرف اس لئے کہ ہم راہنما ہیں- ہمارے وسائل ہیں اور ہمیں پاکستان میں حکومت کرنی ہے چنانچہ بڑے سوچ بچار کے بعد میں کلکتہ ہی میں رک گیا- اور میں نے فیصلہ کیا کہ گاندھی جی کے پاس جاؤں جنہیں میرے متعلق ایک قاتل کا تصور دیا گیا تھا-

گاندھی جی مجھے دیکھ کر عادتاً مسکرائے لیکن ان کی مسکراہٹ میں وہ رونق نہیں تھی جس کی روائتیں عام تھیں وہ صورتحال سے پریشان بلکہ غمزدہ معلوم ہوتے تھے-

گاندھی جی نے مجھ سے کہا-

سہروردی صاحب یہ کیا ہو رہا ہے؟

مہاتما جی انسان پاگل ہو گئے ہیں-

لوگ آپ پر الزام لگاتے ہیں؟

"لیکن وہ ثبوت نہیں دے سکتے ان سے غصہ اور اشتعال کہلوا رہا ہے-"

"ڈائرکٹ ایکشن ڈے پر آپ نے جو کچھ کہا وہ اخبارات

میں چھپ چکا ہے۔"

" اخبارات میں سبھی کچھ صحیح نہیں ہوتا آج کل اخبارات بھی اسی رو میں بہہ رہے ہیں۔"

گاندھی جی کچھ دیر خاموش ہوگئے۔ میں بھی سر جھکا کر بیٹھا رہا۔ پھر کہنے لگے۔

"سہروردی صاحب اب آپ کیا چاہتے ہیں؟"

" مہاتما جی میں آپ کے ساتھ حالات کو معمول پر لانے کے لئے عوام کی خدمت کرنا چاہتا ہوں"

"لیکن آپ سے لوگ بگڑے ہوئے ہیں"

"میں ان کی غلط فہمی کا بھی ازالہ کرنا چاہتا ہوں"

"یہ جان جوکھوں کا کام ہے اس میں جان ہار دینے کا بھی خطرہ ہے"

"میں اس کے لئے بھی تیار ہوں میں نہیں چاہتا کہ لوگوں میں غلط فہمی رہے اور فسادات کی آگ بھڑکتی رہے"

"اچھا تو آپ مجھے اپنے والدین سے لکھوا دیں کہ آپ اس غرض سے جان دینے کو بھی تیار ہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آ گیا تو وہ مجھے دوش نہیں دیں گے؟"

"والدین حیات نہیں ہیں۔ زمانہ ہؤا اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔"

''آپ کا بیٹا ہے۔''

''جی ہاں ! لیکن وہ انگلستان میں پڑھتا ہے''
اور کوئی بچہ ہے ؟
''بیٹی ہے ؟''

''تو اس سے لکھوا دیں کہ وہ اس اعلیٰ آدرش کے لئے پاپا کی زندگی ارپن کرتی ہیں''

''بیٹی اس وقت یہاں نہیں ۔ وہ اپنے شوہر کے ہمراہ پاکستان میں کسی جگہ چلی گئی ہے کچھ معلوم نہیں کہاں ہے ؟آپ مجھ سے لکھوا لیں کہ میں نے اس مقصد کے لئے اپنی زندگی سونپ دی ہے اور آپ کے ساتھ رہ کر بنی نوع انسان کی خدمت کرنا چاہتا ہوں''

گاندھی جی راضی ہو گئے ۔ ہم نے متاثرہ علاقوں کا دورہ شروع کیا ۔ ہندو مجھے دیکھتے ہی طیش میں آ جاتے ۔ مجھے ہی نہیں گاندھی جی کو سخت سست کلمات کہتے ۔ لیکن گاندھی جی ہنستے بولتے اپنا کام کئے جاتے ۔ حتیٰ کہ سخت جد و جہد کے بعد ایک روز انہوں نے صورت حال پر قابو پا لیا ۔ نتیجۃً لاکھوں مسلمانوں کی زندگیاں بچ گئیں اور جن لوگوں کو اپنے روپے سمیت پاکستان منتقل ہونا تھا وہ آسانی سے پاکستان آ گئے ۔

سہروردی صاحب نے لمبا سانس بھرتے ہو کہا ۔

گاندھی جی ایک عظیم انسان تھے ۔ جس سیاسی گاندھی کے متعلق ہمیں مضحک تصویریں دکھائی گئی تھیں یا جو ہم نے خود

تراش لی تھیں وہ اس سے سر تا پا مختلف تھے ان کے پہلو میں ایک انسان کا دل تھا۔

''آپ نے کلکتہ کیوں چھوڑا؟ آپ کا مشن ختم ہو گیا تھا؟ یا گاندھی جی نے آپ کو چھٹی دے دی تھی؟ یا آپ خود ہی چلے آئے؟ میں نے دریافت کیا

''ایسی کوئی بات نہیں؟ ہندوستان کے حالات روز بروز خراب ہو رہے تھے۔ جگہ جگہ سے فسادات کی اطلاعیں آ رہی تھیں۔ دہلی میں فساد کا الاؤ بھڑک اُٹھا مسلمانوں کی آبروئیں لوٹی جا رہی تھیں۔ گاندھی جی کو تار پہ تار آ رہے تھے۔ کہ دہلی پہنچیں۔ اُدھر عام مسلمان بھاگ بھاگ کر مغلئی عہد کے کھنڈروں اور بزرگوں کے مزاروں میں پناہ لے رہے تھے۔

گاندھی جی نے مجھ سے کہا۔

"صورت حال بہت خراب ہو گئی ہے۔ ممکن ہے یہ آگ جو بھڑک اٹھی ہے آسانی سے فرو نہ ہو۔ پولیس اور فوج بھی فسادیوں سے مل گئی ہے۔ حکام بھی مسلمانوں کی دستگیری نہیں کرتے۔ وزارتوں میں بھی فرقہ پرست ذہن کام کر رہا ہے۔ اگر دہلی کا مسلمان اُکھڑ گیا تو پھر ہندوستان میں کہیں بھی مسلمان کے پاؤں جم نہیں سکیں گے۔ پاکستان مزید تین سوا تین کروڑ مسلمانوں کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ آپ جناح کے پاس جائیں اور اُن سے کہیں کہ وہ مجھے چند سو شرنارتھیوں کو ساتھ لے کر کراچی اور لاہور

آنے کی اجازت دیں - اگر انہیں دوبارہ آباد کر لیا گیا تو ہندوستان میں میرے لئے بہت سی آسانیاں ہو جائیں گی - پاکستان سے جو ہندو لٹ پٹ کر آ رہے ہیں ان کی وجہ سے حالات بدتر ہوتے جا رہے ہیں - خود میرے لئے ان لوگوں کو راضی کرنا مشکل ہے جس کی بیٹی پاکستان میں رہ گئی ہے وہ اس کا انتقام ہندوستان کے مسلمان کی بیٹی سے لینا چاہتا ہے - جس کا گھر بار وہاں رہ گیا ہے وہ مسلمانوں کا گھر بار یہاں نہیں دیکھ سکتا - جن کے اعزا وہاں قتل ہو گئے ہیں وہ اس کا بدلہ یہاں کے بے گناہوں سے چکانا چاہتے ہیں "

گاندھی جی نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا - آپ پاکستان جائیں - قائد اعظم سے کہیں کہ میں ان سے بات چیت کرنا چاہتا ہوں اگر وہ دعوت دیں تو مجھے وہاں آنے میں کوئی عذر نہیں ہو گا ؟

"پھر کیا ہوا"

"میں گاندھی جی کا پیغام لے کر کراچی آ گیا "

"قائد اعظم سے ملے آپ "؟

"جی ہاں - میں نے انہیں گاندھی جی کا پیغام دیا انہوں نے فرمایا گاندھی مجھے کس حیثیت میں ملنا چاہتے ہیں ؟ ان کی ہندوستان میں کوئی سرکاری حیثیت نہیں - مجھ سے ہندوستان کا گورنر جنرل یا ہندوستان کا وزیر اعظم بات کرے"

"تو پھر ؟"

''قائد اعظم نے اپنے سامنے رکھے ہوئے سفید کاغذ پر دائرہ بناتے ہوئے کہا''

''سہروردی! - ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی مستقبل نہیں رہا وہ دیوالیہ ہو چکے ہیں یہ کہا اور احساس کی شدت میں ڈوب گئے۔ پھر ایکا یکی فرمایا -

''میں تمہارے انتظار میں تھا تم میرے ذاتی سفیر کی حیثیت سے انگلستان - امریکہ اور یورپ کے بعض دوسرے ملکوں کا دورہ کرو اور وہاں جا کر پاکستان کے قیام اس کی اہمیت اس کی ضرورتوں اور اس کے احوال و آثار پر روشنی ڈالو میں تذبذ ب میں پڑ گیا قائد اعظم بھانپ گئے فرمایا گویا اس وقت تم ملک سے باہر جانے کے موڈ میں نہیں ہو میں نے کہا آپ کا حکم سر آنکھوں پر؟ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ ان کروڑوں مسلمانوں کا مستقبل سخت مخدوش ہے جو ہندوستان میں رہ گئے ہیں اور یہاں کسی طرح بھی نہیں آ سکتے ؟ اور نہ پاکستان میں ان سب کو سما لینے کی گنجائش ہے''؟

قائد اعظم نے کہا اچھا تو نظر بہ ظاہر ان لوگوں کی خد مت کا ایک ہی ذریعہ ہے وہ یہ کہ تم وزارت میں شریک ہو جاؤ اور بحالیات کی ذمہ داری قبول کرو - میں نے انکار کیا نہ اقرار! یہ کہہ کر چلا آیا کہ بنگال سے ہو آؤں پھر جو حکم بھی ہوگا بچشم! اس کے بعد قائد اعظم مرض الموت کا شکار ہو گئے اور کراچی سے

اُٹھ کر دلی چلے گئے - قیام پاکستان کے تیرہ ماہ بعد ان کا انتقال ہوگیا - جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار تھا ؟ وہ بہمہ وجوہ وزارت تو ایک طرف رہی مجھے کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی میں بھی رکھنے کو تیار نہ تھے اور میں بنگال سے کانسٹی ٹیوٹ کا ممبر منتخب ہو چکا تھا - خان لیاقت علی خان نے پہلا وار یہ کیا کہ مجھے اسمبلی کی رکنیت سے محروم کرا دیا میں محسوس کرتا تھا کہ میرے ساتھ یہ سلوک ہو گا - کیوں کہ اس وقت کے بعض قائدین مجھے اپنا حریف سمجھتے تھے - ان کے دماغوں میں یہ وسوسہ تھا کہ میں ان کی جگہ نہیں لے سکتا تو کسی وقت ان کے لئے پرابلم ضرور بن سکتا ہوں - مجھے اقتدار کی فطرت اور اس کے کاروبار کا بخوبی اندازہ تھا - اور میں جانتا تھا کہ میرے علاوہ اور لوگوں کو بھی اسی طرز کے حالات پیش آ کے رہیں گے - طاقت کبھی طاقت کے بغیر جگہ خالی نہیں کرتی وہ اپنی علیحدگی کے لئے اپنے سے زیادہ طاقت چاہتی ہے -

میں نے ملک میں جمہوریت کی نشوونما اور اس کے قیام و استحکام کے لئے ایک مضبوط حزب اختلاف بنانے کا فیصلہ کر لیا - سہروردی نے سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا جب صورتحال یہ ہو تو قدرت معاون ہو کر سروسامان پیدا کرتی ہے - مشرقی پاکستان میں تو ذہنی طور پر فضا سازگار تھی - اور وہاں نورالامین وزارت نے حزب اختلاف کے ذہن کی نشوونما کا اپنے عمل ہی سے راستہ صاف کر دیا تھا لیکن مشرقی پاکستان ہی سارا پاکستان نہیں تھا - اس کے باوجود کہ وہاں کی آبادی عددی طور پر مغربی پاکستان سے

زیادہ تھی اور اس کو پارلیمنٹ میں نصف طاقت حاصل تھی جہانتک معنوی طاقت کا تعلق ہے وہ مغربی پاکستان میں تھی۔ جب تک مغربی پاکستان بیدار نہ ہو۔ اس وقت تک پاکستان میں حزب اختلاف بار آور نہیں ہو سکتی۔ میں نے اس غرض سے لاہور اور کراچی کو منتخب کیا۔ میں محسوس کرتا تھا کہ پنجاب پاکستان کا بازوئے شمشیر زن ہے۔ جہاں تک سیاسی بیداری اور سیاسی فکر کا تعلق ہے لاہور کے لوگوں میں کمی نہیں۔ اس شہر میں بڑے بڑے عبقری اور نابغہ رہتے ہیں۔ تمام قومی تحریکوں کو لاہور ہی سے جلا ملی ہے۔ مسلم لیگ نے یہیں پاکستان کی قرارداد پاس کی کانگریس نے یہیں راوی کے کنارے کامل آزادی کا ریزولیوشن کیا۔ خاکسار تحریک یہاں سے اُٹھی۔ احرار کو یہاں سے آب و ہوا ملی۔ علامہ اقبالؒ عمر بھر یہیں رہے۔ اور یہیں مر کے دفن ہوئے۔ مولانا ظفر علیخانؒ نے یہیں سیاسی بیداری کا بیج بویا مسلمانوں کے بڑے بڑے اُردو روزنامے یہاں سے نکلتے رہے اور اب نکل رہے ہیں چنانچہ میں نے حزب اختلاف کی داغ بیل ڈالنے کے لئے لاہور کو اپنا سیاسی مستقر بنا لیا۔ اتفاقات ملاحظہ ہوں کہ پنجاب کے نوجوان مسلم لیگی لیڈروں میں ٹھن گئی اس وقت یہاں کے تین نوجوان لیگی لیڈروں کا چرچا تھا۔ اولاً نواب ممدوٹ جو قائد اعظم کے صوبہ میں معتمد تھے اور وہ ان سے لگاؤ بھی رکھتے تھے۔ ثانیاً سردار شوکت حیات جن کی وزارت سے سبکدوشی نے انہیں مسلمانوں میں چمکا دیا تھا۔ ثالثاً میاں ممتاز دولتانہ جو ان دونو کی بہ نسبت زیادہ فہمیدہ و سنجیدہ تھے۔ انہیں دشمنوں کو

پچھاڑنے دوستوں کو ساتھ لے کر چلنے اور بڑوں کو شیشہ میں اُتارنے کا ملکہ حاصل ہے ۔ نواب ممدوٹ سالہا سال مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی میں رہے انہیں قائد اعظم کا اعتماد بھی حاصل تھا ۔ خان لیاقت علی خان نے ان کی وزارت توڑ کر گورنری راج قائم کر دیا ۔ لیاقت علی سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے نواب ممدوٹ پر وزارتی بدعنوانی کا مقدمہ کھڑا کیا ۔ "نوائے وقت" جیسا مؤقر روزنامہ ان دھاندلیوں کے خلاف ہو گیا ۔ حمید نظامی کے طاقتور قلم نے لیاقت علی خان کو آڑے ہاتھوں لینا شروع کیا ۔ جس سے ان کی ہوا اکھڑنے لگی ادھر خان ممدوٹ نے مجھے اپنے مقدمہ میں وکیل کر لیا ۔ اور اس طرح میں ان کے ہاں ٹھہر گیا ۔ یہ گویا حزب اختلاف، کی نیو اٹھانے کا مرحلہ تھا جبتک خان ممدوٹ کا مقدمہ چلتا رہا میں حالات کا جائزہ لیتا رہا ۔ عوامی مسلم لیگ کی بنیاد پڑ چکی تھی ۔ اس وقت میرے ساتھ لاہور میں مولانا عبدالستار خاں نیازی اور بعض دوسرے غیر معروف کارکن تھے ۔ خان ممدوٹ کا مقدمہ سال دو سال چلا ۔ آخر وہ اس میں با عزت طور پر بری ہو گئے ۔ یہ گویا عوامی مسلم لیگ کی نئی تشکیل کا آغاز تھا ۔ اُدھر نوائے وقت نے خان لیاقت علی خان پر یمین و یسار سے حملے شروع کر رکھے تھے اسی وجہ سے سر فرانسس موڈی کو گورنری سے نکلنا پڑا ۔ سردار عبدالرب نشتر صوبہ کے گورنر ہو گئے ۔ مشیروں کا زمانہ آیا مگر بیل منڈھے نہ چڑھی ۔ خان لیاقت علی نے کچھ عرصہ بعد مشیروں کو سبکدوش کر دیا ۔ میاں عبدالباری صوبہ مسلم لیگ کے

صدر تھے - ان کی لیاقت علی خان سے تو تکار ہو گئی - لاہور کے جلسہ عام میں لیاقت علی خان کی اہانت کی گئی میاں عبدالباری نے پاکستان کونسل مسلم لیگ کے اجلاس کراچی میں خان لیاقت علیخان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا -

" آپ جس نہج پر مسلم لیگ کو لے جا رہے ہیں اُس سے تنظیم ختم ہو جائے گی وزارت اور صدارت کو الگ رکھیں فسطائی انداز کبھی پروان نہیں چڑھتے آپ نے یہ انداز ترک نہ کئے تو یاد رکھئے گولی لگ جائے گی گولی !

یہ آخری جملہ میاں صاحب نے انگلی اُٹھا کر ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غضبناک ہو کر کہا - کراچی کے بعض مسلم لیگی جو گنگا و جمنا کا پانی پی کر بن پنچھلے پتنگ کی طرح اُڑے پھرتے تھے - میاں صاحب پر پل پڑے - انہیں سخت سست کہا نتیجۃً میاں صاحب نے بھی مسلم لیگ کو خیر باد کہہ ڈالا ——— حمید نظامی کی تحریک پر خان لیاقت علی خان کے معتوبین لاہور میں اکٹھے ہوئے - نواب ممدوٹ ، پیر مانکی شریف ، خان غلام محمد خان لوند خوڑ ، میاں عبدالباری ، ملک محمد انور ، خواجہ عبدالرحیم ، راجہ حسن اختر وغیرہ ، ان کے ساتھ وہ لوگ بھی شامل ہو گئے - جو مسلم لیگ کی جدید آڑان گھاٹیوں سے بے زار ہو چکے تھے - مثلاً میاں امیر الدین میاں محمد امین ، پیر زکوڑی وغیرہم دو روز کی بحث و نظر کے بعد عوامی مسلم لیگ کو نئی شکل دی گئی - ڈیڑھ دن صرف اس بحث میں ضائع ہو گیا کہ نام کیا ہو - سہروردی کے سوا نئی پارٹی بنانے

کا کسی میں حوصلہ نہ تھا ۔ تمام لوگ پچھلی روائیتوں اور حکائیتوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے ۔ ان کے سامنے قائد اعظم کا نام سب سے بڑی طاقت تھا ۔ چنانچہ مس فاطمہ جناح کی لیاقت علی سے ناراضی اور بعض دوسرے اسباب و وجوہ کو سامنے رکھتے ہوئے عوامی مسلم لیگ سے پہلے جناح کا لفظ بڑھا دیا گیا ۔ مقصود یہ تھا کہ اس طرح عوام میں جا سکیں گے ۔ کہ قائد اعظم کی لیگ کے وارث ہم ہیں سہروردی کنویز بنائے گئے انہیں اختیار دیا گیا کہ وہ ملک کے طول و عرض میں پھر کر کنوینںگ کمیٹیاں بنائیں ۔

سہروردی کہولت سے نکل چکے اور عمر کی اس منزل میں تھے جس کو بڑھاپے کا سر آغاز یا عمر کی حد اوسط کہا جاتا ہے ۔ لیکن کام کرنے کی استعداد ، سفر کا حوصلہ ، گھومنے پھرنے کی اُمنگ ، خوش باشی کا ولولہ ، دماغی ریاضت کا انہماک ان میں اتنا تھا کہ اپنے اوپر شب و روز حرام کر لئے ۔ اتنے میں پنجاب اسمبلی کے الیکشن آ گئے ۔ اپوزیشن کے لئے اپنی طاقت کے اظہار ، اپنی تنظیم کی پرورش اور اپنے خیالوں کی اشاعت کا یہ پہلا اجتماعی موقعہ تھا ۔ جناح عوامی لیگ کے تمام زعماء میدان میں آ گئے ۔ نواب ممدوٹ جن کی تن آسانی ضرب المثل رہی ہے ۔ اُنھوں نے بھی دن رات سفر کیا ۔ لاہور تو بالکل عوامی لیگ کے قبضہ میں تھا ۔ اس کے علاوہ صوبہ کے بڑے بڑے شہروں میں اس کا طوطی بولنے لگا ۔ مزید برآں شہری نوعیت کے قصبوں میں بھی عوامی لیگ رچ پچ گئی ۔

کچھ ہی پہلے سہروردی صاحب سے میرا تعارف ہوا تھا - یہی تعارف تعلقات کی بنیاد بن گیا روابط کی تھاہ اتنی گہری ہو گئی کہ ہم ایک دوسرے کے شیدائی ہو گئے - میں ان کے ظاہر و باطن سے شناسا ہوتا گیا - وہ میرے ظاہر و باطن کے واقف کار ہو گئے ہم پر ایک دوسرے کے ذاتی حالات بھی مخفی نہ رہے - ان تعلقات کا آغاز اس طرح ہوا کہ میں نے لاہور میں آٹے کی گرانی پر ایک تقریر کی - اس کے فوراً بعد نوجوانوں کے ایک پر جوش ہجوم نے مال روڈ کے ریسٹورانوں کو لوٹ لیا بعض ہوٹلوں کے شیشے توڑ ڈالے - کیفموں میں گھس گئے- کھانے پینے کی چیزیں چٹ کر لیں - یہ جو کچھ ہوا میرے سان گمان میں بھی نہ تھا - اگلے روز پاکستان ٹائمز کے صفحہ اول پر بحروف جلی چھپا ہوا تھا کہ شورش کاشمیری کی شعلہ بار تقریر کے بعد عوام کے ایک بڑے ہجوم نے مال روڈ کے ریسٹورانوں پر ہلہ بول دیا - اور جو کچھ موجود تھا کھا پی گئے - حقیقت یہ ہے کہ اس مار دھاڑ کے محرک بھی ہمارے کمیونسٹ دوست تھے- اپنے بچاؤ کے لئے انہوں نے شورش کاشمیری کو جلی کرایا - خود معصوم عن الخطا ہو گئے - وہ پاکستان ٹائمز جو میاں افتخار الدین کی ہدایت پر شورش کاشمیری کا نام نہیں لکھتا تھا اُس روز اس کی شہ سرخی کا انٹرو ہی یہ تھا -

دولتانہ وزارت نے ہفتہ عشرہ بعد مجھے گرفتار کر لیا - قاضی احمد شفیع نے ضمانت کی درخواست مسترد کر دی - دوستوں کی خواہش پر سہروردی نے سیشن جج لاہور کی عدالت میں ضمانت کی درخواست

دائر کی۔ اُن دنوں لاہور میں سیشن جج ایک انگریز مسٹر سے تھے۔ اُنہوں نے مسٹر سہروردی کی بحث کو بڑے تحمل اور احترام سے سنا اور فیصلہ اگلے روز پر ملتوی کر دیا۔ فیصلہ کے دن مسٹر سے نے سہروردی کو ریٹائرنگ روم میں بلایا اور وزارت کی منشاء کے بر عکس ضمانت لے لی۔ میں رہا ہو کر سیدھا سہروردی صاحب کے پاس پہنچا۔ وہ خواجہ عبدالرحیم کے ہاں جاوید منزل میں مقیم تھے۔ اُنہوں نے مجھے پہلی بار دیکھا اور میں نے بھی اُن سے پہلی دفعہ ملاقات کی۔ اس سے پہلے میں نے کبھی انہیں دور سے بھی نہیں دیکھا تھا۔ صرف تصویروں سے اندازہ تھا۔ ان کا شکریہ ادا کیا انہوں نے ہونہہ کر کے مسکرا دیا۔ صرف اتنا کہا نوجوان تمہارے شیدائی ہیں۔ کل اور آج وہ دونو روز کمرۂ عدالت میں فیصلہ سننے کے لئے مضطرب رہے۔ یہ مقدمہ کچھ دنوں بعد واپس ہو گیا۔

انتخابات کی مہم شروع ہوئی تو پہلا جلسہ لاہور میں منعقد ہوا۔ ایک لاکھ کا مجمع ہو گا۔ میں نے چار گھنٹے تک متواتر ایک معرکہ آرا تقریر کی پانسہ ہی پلٹ گیا۔ جناح عوامی لیگ کے زعماء میرے گرد ہو گئے کہ ان میں شامل ہو جاؤں۔ چنانچہ حمید نظامی کی خواہش، تحریک اور اصرار پر میں ان کے ساتھ ہو گیا۔ دوسرا جلسہ سیالکوٹ میں تھا جہاں نواب ممدوٹ اُمیدوار تھے۔ اس جلسہ کو خطاب کرنے کے لئے لاہور سے سہروردی، میاں عبدالباری، نواب ممدوٹ اور راقم الحروف گئے۔ رام تلائی میں جلسہ ہوا۔ چاروں طرف بلکہ مکانوں کی چھتوں پر بھی لوگ ہی لوگ تھے۔ میں

نے کوئی دو گھنٹہ تقریر کی ۔ تقریر کا حاصل یہ تھا کہ میں نے سہروردی صاحب کا دل موہ لیا ۔ وہ مجھ پر لٹو ہو گئے ۔ جن الفاظ میں انہوں نے میرا ذکر کیا اور جس اخلاص و محبت سے معانقہ فرمایا اب بھی اس کا تصور آتا ہے تو دل فخر و انبساط محسوس کرتا ہے ۔ تیسرا جلسہ لائل پور میں تھا ۔ میں اس جلسہ میں شریک ہونے سے کنی کترا رہا تھا کیوں کہ وہاں عوامی لیگ کے اُمیدوار کا مقابلہ میر عبدالقیوم سے تھا ۔ میر صاحب سے میرے بہت سے ذہنی رشتے اور ماضی مرحوم کے سیاسی ناطے تھے ۔ میرے لئے یہ مرحلہ بڑا مشکل تھا ۔ میں نے عذر و انکار کیا لیکن حمید نظامی کا اصرار ، خواجہ عبدالرحیم کا تقاضہ ، نواب ممدوٹ کی خواہش اور سہروردی کا احترام غالب آ گیا ۔ لائل پور پہنچے تو جلسہ چشم براہ تھا ۔ مجھ سے پوچھے بغیر ہی میرے نام کا اعلان کر رکھا تھا ۔ طبیعت کھل گئی ۔ لوگوں کے ذوق و شوق کا یہ حال تھا کہ بچھے جا رہے تھے۔ اچانک ابر آ گیا ۔ کوندا لپکا ، بجلی کڑکی ، بوندا باندی شروع ہوئی ۔ مینہ کا جھالا تیز ہو گیا ۔ چاہا تقریر ختم کر دوں لیکن نوجوانوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا ۔ غل مچا کہ بھیگنا منظور ہے لیکن تقریر نہیں رکنی چاہئے ہم تشنہ رہنے کے لئے تیار نہیں ؟۔ چنانچہ بارش میں بھی آدھ گھنٹہ تقریر ہوئی ۔ سہروردی کی شفقت کا یہ حال تھا کہ مجھے جادو گر کہنے لگے اور میری خوشی اس میں تھی کہ میں ان کے دل میں اُترتا جا رہا تھا ۔

الیکشن میں سہروردی نے پنجاب کا کونہ کھدرا چھان مارا

ایک ایک ضلع ایک ایک تحصیل ۔ ایک ایک قصبہ اور دور افتادہ دیہات میں بھی پہنچے ۔ انہوں نے اس مختصر سی مدت میں اتنا بھرپور دورہ کیا کہ دوسرا کوئی لیڈر اس کی نظیر نہیں لا سکتا ۔ خود پنجاب کے لیڈروں کو اس کی توفیق نہ ہوئی ! جن لوگوں نے پنجاب پر حکمرانی کی اور جو پنجاب کے وارث سمجھے جاتے تھے انہوں نے بھی پنجاب کو اس طرح نہیں دیکھا جس طرح سہروردی نے دیکھا اور پڑھا ۔ وہ پنجاب کے رگ و ریشہ سے واقف ہو گئے تھے ۔ انہیں ادنیٰ درجے کے سیاسی کارکنوں سے لے کر اعلیٰ درجہ کے بزرجمہروں تک کے خط و خال سے آگاہی ہو گئی ۔ وہ ہر ضلع کی سیاست اور اس کے مزاج و طبیعت کی بو قلمونی سے واقف تھے ۔ انہیں اس صوبہ کے جغرافیہ اس کی تاریخ ۔ اس کی تہذیب ۔ اس کی معاشرت ۔ اس کی سیاست اور اس کے جرائم و اکرام تک سے آگاہی تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ پنجاب کے بیشتر اخباروں کے ایڈیٹر اتنی واقفیت اپنے صوبہ کے مزاج و سرشت سے نہیں رکھتے جتنی واقفیت انہیں حاصل ہو چکی تھی ۔ یا انہوں نے فراہم کر لی تھی ۔ وہ صوبہ کے دیوتاؤں کی کمزوریوں اور خوبیوں سے بھی کما حقہ واقف تھے ۔ انہیں واعظوں کے حجروں ۔ سیاستدانوں کے محلوں ۔ اخباروں کے دفتروں ۔ رندوں کے حلقوں ۔ بجلیوں کے نشیمنوں اور گرہ تراش بالا خانوں کی سیڑھیوں کے ایک ایک موڑ سے آشنائی تھی اور یہ معلومات انہوں نے اُڑتی پھرتی حاصل نہیں کی تھیں بلکہ بلا واسطہ اور خود فراہم کی تھیں ۔ ان کی عادت تھی کہ مختلف فائلیں اور کئی

ایک نوٹ بکیں ساتھ رکھتے اُن پر ہر عنوان ، ہر موضوع ہر بحث اور ہر گفتگو کے ضروری نوٹ لیتے ۔ صرف پنجاب ہی کے متعلق ان کے پاس معلومات کا اتنا ذخیرہ ہو گیا تھا کہ ان کاغذوں کو ڈھیر کیا جائے تو کئی فٹ کی ایک تھئی بن سکتے ہیں ۔

سرحد کے متعلق ان کی معلومات مختلف حلقوں سے فراہم کی ہوئی تھیں ۔ وہ کسی ایک حلقے کی اطلاع یا خبر کو مستند نہیں سمجھتے تھے جب تک ہر گوشہ سے اس کے متعلق واقفیت بہم نہ پہنچا لیں ۔ سندھ کے متعلق بھی انہوں نے معلومات اسی طرح جمع کی تھیں ۔ بلوچستان کے مسئلہ میں بھی ہر نوعی معلومات جمع کرتے رہے ۔ کراچی کا پالٹیکس تو ان کے سامنے بوبہنہ ہو کر رہا ۔مشرقی پاکستان ان کا گھر تھا ۔ وہاں سے معلومات اس طرح آتی تھیں جس طرح صبح کی ہوا شاخساروں میں چلی آتی ہے ۔ اس لحاظ سے پاکستان کا ایک لیڈر بھی (الا ما شا اللہ) ان کا ہم پلہ نہ تھا ۔ وہ ہر چھوٹی بڑی چیز کے بارے میں معلومات فراہم کرنے کے شائق تھے ۔ یہ ان کا ذوق تھا اور تھکی ہوئی عمر کے باوجود وہ اس معاملہ میں تازہ دم رہتے ۔ ان کے رفقائے سفر میں قلم اور کاغذ برابر کے شریک تھے ۔ تکلف نام کو بھی نہیں تھا عموماً سادہ رہتے ٹیپ ٹاپ ہوتے صرف عدالت میں پیش ہوتے وقت وکلاء کا لباس پہن کر جاتے ۔ سیاہ گاؤن ان کے پاس اپنا نہیں تھا ۔ مانگ کر پہنتے ۔ یا جب انہیں کلب میں جانا ہوتا ، اس کے سوا وہ کبھی کسی تقریب میں شمول کے لئے تکلف نہیں برتتے تھے ۔ عموماً کھلے گلے کا کرتہ

پہنتے - نیچے پاجامہ- پاؤں میں سفید جوتی - سخت گرمیوں میں اور بھی کھلے ڈلے رہتے یا پھر سیر و تفریح کے وقت ڈھیلی ڈھالی پتلون اور اس پر بوشرٹ پہن لیتے - کھاتے خوب تھے - بلکہ ڈٹ کے کھاتے ہر غذا مرغوب تھی بسا اوقات اپنی خوراک کو انتہائی مضحک بنا لیتے - کئی سالنوں کا ملغوبہ تیار کر کے کھاتے آموں کے بڑے شوقین تھے لیکن آموں کا ذوق بھی مضحک تھا کبھی انہیں دو آتشہ اور کبھی سہ آتشہ کر کے کھاتے - مثلاً آم کی بڑی پھانک میں فرنی ڈال لی آمیختہ کیا اور کھا گئے ایک روز آموں کے گودے میں زردہ ملا کر کھا رہے تھے کھانے کا یہ حال تھا کہ انگریزی کھانوں سے بھی رغبت تھی اور دیسی کھانوں سے بھی لگاؤ تھا - ناشتہ کرنے کے لئے لوہاری دروازہ کے اندر دہلی کے نہاری والے کی دوکان پر چلے جاتے تھے - جہاں صفائی کا شائبہ تک نہیں - دوپہر کا کھانا شیزان میں کھا لیا - سہ پہر کی چائے کافی ہاؤس میں پی لی - رات کھانے کو جی چاہا تو حمید نظامی وغیرہ کو ساتھ لے کر اندرون شہر چونے منڈی میں خلیفہ کے ہاں چلے گئے خلیفہ کے کباب کا چسکہ نظامی مرحوم کو بھی تھا - ایک ناٹے قد کی مسجد کے نیچے خلیفہ کی دکان تھی - دکان کیا ایک تھڑا تھا اس تھڑے کے پہلو میں ایک ۳ × ۴ فٹ کا دڑبہ تھا جہاں ارسطو کے وقت کی ایک میز اور فیثا غورث کے زمانے کی کرسیاں پڑی ہوتی تھیں - ہم لوگ درجنوں کباب چٹ کر جاتے وہاں سے پیدل نکلتے کیوں کہ چونے منڈی کا

بازار ملا کے ذہن کی طرح تنگ تھا ۔ ڈاکٹر دلاور علی شاہ کے مطب سے ذرا آگے موٹر کھڑی کی ہوتی وہاں سے موٹر ہی میں راستوں کے پیچ و خم کاٹتے ہوئے سرکلر روڈ پر آ نکلتے ۔ کبھی ریلوے اسٹیشن کی طرف مڑ جاتے کبھی راوی کی طرف ۔ موٹر ستر میل کی رفتار سے خود چلاتے تھے ۔ گوجرانوالہ روڈ پر بیس پچیس میل کا چکر کاٹا واپس آ گئے یا پھر چاندنی میں راوی کے کنارے بان کی ایک ٹوٹی پھوٹی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ کبھی کبھار کشتی میں سوار ہوجاتے ملاح سے چپو لے کر خود گھماتے اور دور تک کشتی کھیتے ہوئے نکل جاتے ۔ اس وقت ان کی باتوں میں رکھ رکھاؤ بالکل ہی نہ ہوتا ۔ بڑے مزے کی باتیں کرتے ۔ انگریزی کے اشعار سناتے ان کا مطلب بتاتے اگر طبع رک جاتی تو فارسی شاعری سے جی بہلاتے ۔ حافظ پر گفتگو کرتے ۔ آب رکنا باد کا ذکر چھیڑ دیتے اور اگر کسی گوشہ سے اچانک کسی رسیلے گلے کی آواز نکل رہی ہوتی تو سراپا گوش ہو جاتے ۔ موسیقی سے انہیں بڑا لگاؤ تھا ۔ وہ شلر کے الفاظ میں اس کو عالم انسانیت کی مشترکہ زبان کہتے تھے ۔ موسیقی کے بارے میں بڑے مزے کی باتیں کرتے ۔ باتیں تو وہ ہر عنوان پر مزے ہی کی کرتے تھے لیکن فنون لطیفہ کے بارے میں گلفشانئ گفتار کا مزہ آ جاتا ۔ موسیقی کے متعلق ان کا خیال تھا کہ آواز کا جادو ہے ۔ بعض راگوں کی جڑیں بھی جانتے تھے ۔ ان کے تنے اور شاخوں پر دل کھول کے گفتگو کرتے ۔ اس وقت وہ سیاستدان سہروردی معلوم نہیں ہوتے تھے بلکہ محسوس ہوتا تھا کہ ہم ایک ایسے شخص سے ہمکلام ہیں جس نے موسیقی کے اشغال کی باقاعدہ تربیت حاصل کی

ہے۔ شاعری سے انہیں طبعی لگاؤ تھا۔ خود انگریزی کے شاعر تھے بلکہ بعض انگریزی دانوں کی روائت کے مطابق انگریزی نثر میں شاعری کرتے تھے۔ اُردو شاعری سے بھی انہیں مناسبت تھی لیکن فارسی شاعری اور عربی شاعری کے بعض تیر و نشتر نوک زبان تھے۔ ایک دفعہ کہنے لگے میری والدہ عربی کی شاعرہ تھیں۔ ان کا دیوان گھر میں محفوظ ہے۔

غرض ان کا خاندان علم کا گہوارہ تھا۔ کئی خاندانوں کے علمی سلسلے ان کے خاندان میں جمع ہو گئے۔ ایک وقت تین تین اور چار چار نائٹ (سر) ان کے خاندان میں رہے۔ ان کے ماموں عبداللہ المامون سہروردی ایک نامور شخصیت تھے۔ ان کے والد سر زاہد حسین سہروردی ہائی کورٹ کے جج تھے۔ ان کے بھائی شاہد سہروردی آکسفورڈ میں انگریزی کے استاد رہے۔ حکومت پاکستان نے انہیں سپین میں سفیر مقرر کیا۔ سر عبدالرحیم ان کے خسر تھے اس اہلیہ سے اکلوتی بیٹی سر شاہ سلیمان کے بیٹے سے بیاہی ہوئی ہے۔ شاہ سلیمان ان کے سمدھی تھے۔ شائستہ سہروردی ان کی پھپھیری بہن ہیں۔ ان کے شوہر اکرام اللہ پرانے آئی سی ایس، پاکستان کے فارن سیکرٹری اور انگلستان میں ہائی کمشنر تھے۔ خود شائستہ سہروردی آج کل مراکش میں پاکستان کی سفیر ہیں۔ پچھلے دنوں خبر آئی تھی کہ وہ سہروردی کی سوانح عمری لکھ رہی ہیں۔

مصوری سے بھی انہیں ایک گونہ شغف تھا۔ بعض نادر تصویروں کو جمع کرتے لیکن فوٹوگرافی کے بہت شوقین تھے۔

ان کے پاس بہت سے کیمرے تھے۔ کوئی درجن بھر تو مووی کیمرے ہوں گے یہ ان کی ہابی (Hobby) تھی وہ ان سے مختلف الاصل اور مختلف العنوان تصویریں بڑے شوق سے بناتے۔ سنگتراشی یا مجسمہ سازی کے بارے میں ان کا نقطۂ نگاہ خالص یورپی تھا۔ لیکن وہ مغلوں کے فن تعمیر کے بہت دلدادہ تھے۔ ان کا بیان تھا کہ ان سے شوکت اور سطوت کا اظہار ہوتا ہے۔ مسلمانوں نے فن تعمیر میں جو کمالات دکھائے ہیں ان کا تذکرہ بڑے فخر سے کرتے۔ تاج محل آگرہ کے متعلق ان کا خیال تھا کہ وہ سنگ مرمر کی شاعری ہے۔ یا پھر ایک دفعہ انہوں نے تاج محل کی رعنائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ فنون لطیفہ پتھروں میں منتقل ہو کر عجائبات عالم کا معجزہ ہو گئے ہیں۔ انہیں ہندوستان میں مسلمانوں کے آثار و مظاہر کی جدائی کا بڑا قلق تھا وہ ان کی مفارقت کو بری طرح محسوس کرتے مثلاً فتح پور سیکری کو وہ مغلوں کے گمشدہ جاہ و جلال کی تاریخ خیال کرتے تھے۔ دہلی کا لال قلعہ اب انہیں بابر و اکبر کی فتح مندیوں کا مد فن محسوس ہوتا تھا۔ جامع مسجد دہلی کا ان کی طبیعت پر ایک خاص اثر تھا لیکن لاہور کی شاہی مسجد کے شکوہ کو زیادہ دلفریب خیال کرتے۔ میں نے علامہ اقبال کا تاریخی تبصرہ سنایا کہ علامہ نے دہلی کی جامع مسجد کو بیگم کہا تھا تو بہت محظوظ ہوئے۔ دیر تک سر دھنتے رہے۔ کہنے لگے کہ اس تنقید کی شرح نہیں ہو سکتی ایک یورپی مصنف کے اس قول کو نقل کیا کہ مغل اپنی عمارتوں کو دیووں کی طرح اٹھاتے اور پریوں کی

طرح ختم کرتے تھے۔

کسی فرد سے بھی مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ بعض بڑے بڑے راہنماؤں کا ذکر بھی سرسری لہجہ میں کرتے میں ان کے خیالات سے روز بروز آگاہ ہو رہا تھا۔ افسوس کہ یہ باتیں قلمبند کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں اور نہ ہمارے ہاں ابھی تاریخ کا مذاق اتنا فراخدل واقع ہوا ہے۔ تاہم وہ عیب بینی اور عیب بیانی سے عموماً گریز کرتے بلکہ اس طرف آتے ہی نہیں تھے۔ جن لوگوں نے آن پر کیچڑ اچھالا یا جو لوگ ان سے دغا کر گئے اور ان کی ذات پر بہتان باندھتے رہے ان کے متعلق بھی کبھی کلمۂ دشنام نہیں کہا۔ لیکن افراد و شخصیات کے معاملہ میں بے روک ہو کر رائے دیتے۔ کبھی غیر شریفانہ جملہ زبان پر نہ لاتے۔ اور اتہام باندھنا تو ان کی فطرت سے خارج تھا۔ خواجہ ناظم الدین، لیاقت علی کے زمانے میں گورنر جنرل تھے جب لیاقت شہید ہوگئے تو خواجہ صاحب وزیر اعظم بنے۔ لوگوں نے ان کے خلاف اکثر مظاہرے کئے کئی افسانے تراشے مختلف نام رکھے غرض چھوٹ زبانوں نے سبھی کچھ کہا مگر سہروردی نے ان کی ذات کو ہدف تنقید بنانے سے گریز ہی کیا ایک روز میں نے خواجہ صاحب کے متعلق ان سے دریافت کیا کیسے آدمی ہیں؟ کہنے لگے

"مکمل شریف انسان ہیں"

البتہ خان عبدالقیوم کے متعلق اُنہیں اکثر و بیشتر غصہ آ جاتا تاہم زبان سے وہ کوئی ایسا کلمہ نہیں نکالتے تھے۔ جس سے شرافت

مجروح ہو۔ ان کی نپی تلی رائے تھی کہ آمر فطرت کے انسان اسی وقت تک ہیبتناک ہوتے ہیں جب تک ان کے پاس اقتدار ہو۔ اقتدار سے محرومی کے بعد وہ کسی اُفتاد کی ہلکی سی آنچ بھی نہیں سہہ سکتے بلکہ آزمائش و امتحان کے مرحلوں میں بزدل ثابت ہوتے ہیں۔ ان کے مردم شناس و اندازہ شناس ہونے کا ایک اور واقعہ مجھے اب تک یاد ہے۔ ختم نبوت کے مارشل لاء میں وہ پہلی دفعہ سکندر میرزا سے ملے تو میرزا ڈیفنس سکرٹری تھا۔سہروردی نے اس سے گھنٹہ بھر ملاقات کی اس ملاقات کے تاثرات بیان کرتے ہوئے بتایا کہ میرزا انتہائی شاطر اور عیار آدمی ہے۔ میں نے اندازہ کیا ہے کسی وقت یہ شخص پاکستان میں حکمران ہو گا۔ چنانچہ وہی ہو کے رہا۔ حمید نظامی کا بہت زیادہ احترام کرتے تھے۔ ختم نبوت کی تحریک کے سوال پر نظامی ان سے بگڑ گئے اور نوائے وقت میں نکتہ چینی شروع کی۔ لیکن تمام اختلافات کے باوجود جو آگے چل کر ان کے اور نوائے وقت کے درمیان مختلف سیاسی مسئلوں میں پیدا ہو گئے۔ سہروردی صاحب کی اس رائے میں ذرا بھر فرق نہ آیا کہ حمید نظامی عظیم محب الوطن ناقابل تسخیر ایڈیٹر ایک بہادر دوست اور جری دشمن ہیں۔

میں نے ایک دفعہ سوال کیا۔ بابا! آپ کی کوئی خواہش ہے؟ کہنے لگے۔ کیوں نہیں۔ ہر انسان کے ساتھ کوئی نہ کوئی خواہش لگی ہوتی ہے۔ میں نے کہا آپ کے ساتھ کون سی خواہش ہے؟ آپ تو ہر مقام اور ہر منزل سے گزر چکے ہیں۔ کہنے لگے میری دو

خواہشیں ہیں - پہلی خواہش تو یہ ہے کہ میں ایک دفعہ پاکستان کا وزیر اعظم بنوں اور جو میرے دل میں ہے اس کو پورا کروں - میں لوگوں کو احساس دلانا چاہتا ہوں کہ فی الواقعہ وہ آزاد ہو چکے ہیں -

دوسری خواہش -

چپ ہو گئے - میں نے دوبارہ پوچھا - طرح دے گئے - میں نے اعادہ کیا کوئی اور مضمون چھیڑ دیا - میں نے روک کر اپنا سوال دہرایا - کہنے لگے شورش ! میری ایک عجیب سی خواہش ہے - میں نے کہا وہ کیا ؟

فرمایا میں چاہتا ہوں پاکستان کے لوگ اتنے متحمل مزاج ہو جائیں کہ میں پبلک میں کھڑے ہو کر اُس گاندھی کو پیش کر سکوں جس کو میں نے ساتھ رہ کر دیکھا - تجربہ کیا اور اس سے بالکل مختلف پایا جس کی تصویر سیاسی مقاصد کے تحت ہمارے ہاں بنائی جا چکی ہے

”تو کیا آپ گاندھی جی کے قائل ہو چکے تھے؟“

”میں ان کا گرویدہ ہو گیا تھا پاکستان کا سوال اور اس کا حصول ، ہماری جد و جہد اور اس کے نتائج ، اس کو الگ کر دیں اور بحث و نظر سے قطع کر لیں تو حقیقت یہ ہے کہ گاندھی جی ایک عظیم انسان تھے- ان کے سینہ میں واقعی ایک رشی کا دل دھڑکتا تھا“

وزیر اعظم تو وہ ہو گئے لیکن ان کی وزارت عظمیٰ کا زمانہ اور محل دونو غلط تھے وہ اپنی طاقت کے بل پر وزیر اعظم نہیں ہوئے تھے - اسی ممبروں کی نیشنل اسمبلی میں ان کے کل تیرہ ساتھی تھے -

وہ چاہتے تو بکاؤ مال کو خرید بھی سکتے تھے لیکن اُنہوں نے خفیہ بخت و پز اور سیاسی خرید و فروخت سے اجتناب کیا ۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے جب ایک ممبر نے ان کی جماعت میں شریک ہونا چاہا تو انہوں نے صاف انکار کر دیا ۔ اس سے کہا پہلے اپنی نشست سے استعفیٰ دو پھر عوامی لیگ کا ٹکٹ لے کر الیکشن لڑو ۔ لوگوں نے ان کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کو ہوا دی ۔ لیکن میری موجودگی میں انہوں نے الیکشن کمشنر سے کہا تھا کہ اس ملک کو بچانا چاہتے ہو تو الیکشن آزاد کرانا ورنہ طاقت کے ہاتھ میں کھیلنا ملک کے لئے بالآخر نقصان دہ ہو گا ۔

ان کی بد قسمتی یا ملک کی بدقسمتی کا دوسرا سبب سکندر میرزا کا وجود تھا جو بغیر کسی عوامی رشتہ کے سیاستدانوں کی معرفت صدر ہو گیا بلکہ پاکستان کا پہلا صدر جمہوریہ بنا ۔ سکندر میرزا سے زیادہ گھٹیا اور ذلیل انسان پاکستان نے کبھی نہیں دیکھا اس شخص نے پورے ملک سے وہی سلوک کیا جو اس کے جد امجد میر جعفر نے انگریزوں کے ساتھ مل کر سراج الدولہ سے کیا تھا ۔ سکندر میرزا کے خون میں خرابی تھی ۔ وہ چوبیس گھنٹہ کا شرابی تھا ۔ اس کی سیرت کا اندازہ صرف اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے کہ اس نے غیر ملکی سفارت خانے کے ایک آفیسر کی بیوی کو اغوا کیا ۔ جو اس کے حبالہ عقد میں آ کر ناہید میرزا ہوگئی ۔ اُس آفیسر کو بیوی سے محرومی کے بعد ملازمت سے بھی محروم ہونا پڑا ۔

میرزا نے اپنی زندگی کا آغاز صوبہ سرحد میں ایک پولیٹیکل ایجنٹ

کی حیثیت سے کیا تھا۔ ان قبائلی ملکوں کو برطانوی استعمار کے لئے اس نے جس طرح استعمال کیا اور جو گل کھلائے وہ ساری کہانی انتہائی شرمناک ہے۔ اسی کے صلہ میں آئی سی ایس کا رکن نہ ہونے کے باوجود پشاور کا ڈپٹی کمشنر بنایا گیا۔ وہاں سے مرکزی حکومت کی وزارت دفاع میں پہنچا۔ اور اس قسم کے شرمناک کارنامے انجام دیتا رہا کہ پناہ بخدا۔

جس زمانہ میں پشاور کا ڈپٹی کمشنر تھا اس نے خدائی خدمتگاروں کے دستوں کو گرفتار کرنے کے بعد دھتورا کھلا دیا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک میں خدائی خد متگار اپنے آپ کو ہر روز گرفتاری کے لئے پیش کرتے۔ حکومت انہیں جیل میں نہیں رکھنا چاہتی تھی پکڑتی اور چھوڑ دیتی۔ وہ دوبارہ سہ بارہ چلے آتے۔ حکام پریشان تھے۔ سکندر میرزا نے سب کو گرفتار کیا۔ کوئی دوائی ملا کر چائے پلائی اور چھوڑ دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان سب کو دست پہ دست آنے لگے۔ پھر پیچش ہو گئی۔ تحریک کی رفتار چندے مدھم پڑ گئی۔ بلکہ رک گئی۔ ڈاکٹر خانصاحب کی انگریز بیوی میں سے جس لڑکی نے فوج کے ایک عیسائی میجر یا کیپٹن سے شادی کی تھی اس سازش اور ملاپ میں بھی میرزا ہی کا ہاتھ تھا۔ ڈاکٹر صاحب اور میرزا دونو شطرنج کے کھلاڑی تھے۔ انگریز گورنر کی شہ پر میرزا نے دوستی کے پردے میں یہ ناٹک کھیلا۔ مقصود یہ تھا کہ پٹھان قوم اس طرح بھڑک اٹھی۔ تو امان اللہ خاں کی طرح خان برادران کا چراغ بھی گل ہو جائے گا۔ مگر تیر خطا گیا۔ افسوس انہی ڈاکٹر خانصاحب نے

چودھری محمد علی کی تحریک کی تائید کرتے ہوئے سکندر میرزا کا نام صدارت کے لئے پیش کیا ۔ جو قومی نمائندوں نے اسماء حسنہ کا جز و لاینفک سمجھ کر قبول کر لیا ۔ اور جلوس کی شکل میں مبارکباد دینے کے لئے ایوان صدارت تک گئے ۔

سہروردی بھی سکندر میرزا کے جھانسے میں آ گئے ۔ غالباً اُس کی داخلی فطرت سے ناواقف تھے۔ میرزا نے ریپبلیکن پارٹی کو اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا اس کی فطرت میں نچلا بیٹھنا لکھا ہی نہ تھا وہ ہر روز سازش کی نیو رکھتا اور نت نئی شرارت اُچھالتا تھا ۔ یہ اُس کا مزاج اور اس کی سرشت بن چکا تھا ۔ اس نے ہر پتے کو ترپ کا پتہ بنا لیا ۔ ریپبلیکن لیڈروں سے اندر خانہ سہروردی کو برا بھلا کہلواتا خود ان میں سے ہر ایک کو برا بھلا کہتا ، اور صرف وہی لوگ اس کے دوست تھے جو اسکے ساتھ صبح و شام شراب پیتے اور ہارنے کے لئے جوا کھیلتے تھے ، اپنے وزیروں کے متعلق اسکی ذہنیت یہ تھی کہ بعض کے دلچسپ واقعات سنا کر انکی رسوائی کے مزے لیتا ۔ سرحد کے ایک وزیر کے متعلق جو خان عبدالقیوم خان کے دست و بازو رہ چکے تھے اس نے حمید نظامی کی موجودگی میں راقم الحروف سے کہا تھا کہ سرخ پوشوں کی تحریک میں پچاس روپے ماہانہ پر انفارمر تھا ۔ پدر سوختہ اس کا تکیہ‌کلام تھا ۔ جس کا ذکر کرتا پدر سوختہ سے شروع ہوتا اور پدر سوختہ پر ختم کرتا ۔ اس کی نگاہ میں سارا ملک ہی پدر سوختہ تھا ۔ غرض سارے ملک کو اس نے دہشت زدہ کر رکھا تھا ۔

میں اس سے دو دفعہ ملا - ایک دفعہ گرمانی صاحب کے مکان پر جب گرمانی صاحب مرکزی حکومت میں وزیر داخلہ تھے اور میرزا ڈیفنس سکریٹری - گرمانی صاحب نے مجھے چائے پر مدعو کیا اور میں اُن سے پہلی دفعہ ملنے گیا تھا - اچانک وہاں میرزا بھی آ گیا - میں گرمانی صاحب سے کہہ رہا تھا کہ اختر علی خاں کو پیرول پر رہا کر دیں - اول تو وہ خود معافی مانگ چکے ہیں دوسرے ان کے والد مولانا ظفر علی خاںؒ گور کنارے ہیں - اختر علی خاں کے لئے نہیں تو انہیں مولانا ظفر علی خاں کے لئے ہی رہا کر دینا چاہیئے - آخر مولانا ظفر علی خاںؒ کی قومی خدمات کا ایک عظیم ریکارڈ ہے - ان کا اعتراف ہی سہی - یہ لاہور کے مارشل لاء کے اختتامی دنوں کا ذکر ہے - سکندر میرزا یہ معلوم کئے بغیر کہ میں کون ہوں ؟ جھنجھلا کر ٹپک پڑا - - - - اختر علی خاں کو رہا نہیں کیا جا سکتا ؟ وہ بے ایمان ہے -

" تو اس کے لئے والدکی خاطر چھوڑ دیجئے - مولانا ظفر علیخاںؒ کی خدمات تو بڑی عظیم ہیں " میں نے عرض کیا -

وہ بھی پدر سوختہ تھا - سکند میرزا نے شرابی آنکھوں میں حقارت کو سمیٹتے ہوئے کہا - مجھے ناگوار گذرا - میں نے ٹوکتے ہوئے کہا -

"مولانا ظفر علی خاںؒ کو گالی دینا افسوسناک ہے ؟ وہ مر رہے ہیں"

تو مرنے دیجئے میرزا نے پھر جھنجھلا کر زہر اُگلا - کوئی

ہفتہ عشرہ پہلے خبر آئی تھی کہ سکندر مرزا کا ایک فرزند ہوائی حادثہ میں لندن جاتے ہوئے مر گیا ہے

" میں نے اس حادثہ کا حوالہ دیتے ہوئے کہا - آپ کو یہ بات نہیں کہنی چاہئے ابھی تو آپ نے پچھلے ہفتہ بیٹے کا غم دیکھا ہے"

اس سے میرزا صاحب کی زبان قدرے رک گئی - تھوڑی دیر بعد انہوں نے دو جملے اور کہے - ایک یہ کہ جب تک مسلم لیگ کو دفن نہیں کیا جائے گا ملک میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا - دوسرا جملہ ان کا یہ تھا کہ گرمانی صاحب آپ کی وجہ سے مُلا لوگ بچ گئے - میں نے تو کابینہ کو انہیں پھانسی پر لٹکوانے کے لئے ہموار کر لیا تھا - اور نہیں تو کم از کم مودودی کو ضرور لٹکا دینا چاہئے تھا -

گرمانی صاحب بھانپ گئے کہ میں اس کا جواب دوں گا - وہ مجھے اٹھا کر ایک طرف لے گئے اور اختر علی خاں کو پیرول پر چھوڑنے کا وعدہ کر لیا -

دوسری دفعہ میں سکندر میرزا سے ایڈیٹروں کے ساتھ ملا - اس نے ہمیں عشائیہ پر مدعو کر رکھا تھا -

" با ملاحظہ ہوشیار - صدر صاحب تشریف لاتے ہیں "

ہم ایک قطار میں کھڑے ہو گئے - آگے آگے ملٹری سکریٹری ، ایڈی کانگ ، درمیان میں وہ خود ، پیچھے پیچھے حوالی موالی ، ہر ایک سے ہاتھ ملاتے ہوئے نکل گیا - شراب کے بھبکے اس کے منہ

سے اُڑ رہے تھے۔ اس رسمی کارروائی کے بعد ہم گھل مل گئے سب نے کھڑے کھڑے کھانا کھایا۔ میرزا الگ کھڑا گپ بازی کرتا رہا۔ ایڈیٹروں میں اکثر قلم فروش کورنش بجا لائے۔ مجید لاہوری کو میرزا نے خود بلایا۔ مجید کھاتے نہیں ہو کچھ؟

خشک کھانا ہضم نہیں ہوتا!

تو کیا چلے گا؟

کیوں نہیں؟

"بھئی ان میں کچھ ڈاڑھیاں گھسی ہوئی ہیں خیر انہیں بھی وضو کرا دیں گے"

شراب آگئی۔ مجید لاہوری نے ڈٹ کے پینا شروع کی۔ اور طور سے بےطور ہو گئے۔ وہ میرزا کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے اور باہم مل کر ملاؤں پر پھبتیاں کستے رہے۔ ان کے ملٹری سکریٹری نے میرے متعلق کہا۔

"جناب میری بیوی ان کی بہت زیادہ قائل ہے۔ اور انہیں کشمیری ہونے کی وجہ سے ملک کا سب سے بڑا خطیب سمجھتی ہے"

مرزا نے میرا نام سنا تو غالباً انہیں گرمانی صاحب کا گھر یاد آ گیا دوبارہ مصافحہ کیا۔ نشہ میں دھت کہنے لگا۔

"اس ملک اور قوم کا علاج صرف مارشل لاء ہے۔

"جی نہیں، آپ یہ نہ کہئے، آپ کو اپنی معراج حاصل ہو چکی ہے مارشل لاء لگا تو سب سے پہلے اس کا شکار آپ خود ہوں گے"

"یہی بات غالباً انہیں نواب زادہ نصر اللہ خاں نے کہی تھی۔

مرزا بھونچکا رہ گیا ۔
معلوم ہوتا ہے تمہارا ذہن نصراللہ خاں سے ملتا ہے ۔ تم دونو ایک ہی طرح سوچتے ہو ۔
جی نہیں ۔ تاریخ کے تجربے سب لوگوں کے لئے یکساں ہوتے ہیں ۔
بریگیڈیر نوازش علی مجھے پکڑ کر ایک طرف لے گئے ۔ اور سکندر میرزا مجید لاہوری سے دوبارہ شرابی قہقہوں میں مشغول ہو گیا ۔

ان واقعات سے چند سال پہلے ۔ پنجاب کے انتخابات ختم ہوتے ہی نواب ممدوٹ ، سہروردی سے کھنچنے لگے ۔ نظر بہ ظاہر کوئی خاص وجہ نہ تھی ۔ سہروردی نے ان کا مقدمہ بڑی محنت ، شوق اور اخلاص سے لڑا تھا ۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے انہوں نے نواب صاحب سے اس طویل مقدمہ کی فیس تک نہ لی تھی ۔ اور اگر کوئی فیس لی تھی تو ایک لاکھ کے لگ بھگ روپیہ نواب صاحب کی طرف واجب الادا تھا ۔ یہ روپیہ سہروردی صاحب نے ترک کر دیا ، ان کا بنگلہ بھی چھوڑ گئے اور لاہور میں خواجہ عبدالرحیم (بار ایٹ لاء) کے ہاں رہنے لگے ۔ نواب صاحب کے کھنچاؤ کی وجہ زیادہ تر ان کی طبیعت ، مزاج اور سیرت کا ایک خاص پہلو تھا جو نوابوں اور نوابزادوں کی فطرت ہوتا ہے ۔ وہ اپنی سطح سے کمتر لوگوں میں گھل مل کر نہ رہ سکتے تھے ۔ سہروردی نے عوامی لیگ کو واقعی عوامی لیگ بنا دیا ان کے گرد بعض عوامی لوگ جمع ہو گئے بلکہ ان کے دستر خوان پر وہ لوگ بیٹھتے اور کھاتے پیتے تھے جنہیں نواب صاحب اپنے

باورچی خانہ میں بھی کھانا دینے کو تیار نہ ہوں۔ دوسری وجہ سہروردی کا ان کے مقابلہ میں ذہنی بلوغ فکری ارتقا اور سیاسی مرتبہ تھا۔ نواب صاحب قائد اعظم کے بعد اب کسی شخص کو اپنا قائد اعظم بنانے کے لئے تیار نہ تھے۔ اور جہاں تک قابلیت کا تعلق تھا انہیں سہروردی صاحب سے کوئی نسبت نہ تھی۔ تیسری وجہ نواب صاحب کا سیاسی گٹھ جوڑ تھا مثلاً انہیں شکایت تھی کہ سہروردی ممتاز دولتانہ سے ملتے ہیں۔ سہروردی کہتے تھے کہ سیاسیات میں دوست دشمن سبھی سے ملا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ نواب صاحب پر دولتانہ کو ترجیح دے رہے ہیں یا ان سے کوئی سمجھوتہ کر رہے ہیں۔ نواب صاحب کے سامنے کوئی آئیڈیل نہ تھا۔ وہ صرف دولتانہ کو شکست دینا چاہتے تھے۔ اس غرض سے وہ سرحد کے ”مرد آہن“ خان عبدالقیوم خان سے بھی جوڑ توڑ میں لگے رہے۔ عوامی لیگ کے پیر مانکی شریف اور خان غلام محمد لوند خوڑ کو شکائت تھی کہ نواب صاحب کی اس روش سے ان کی مشکلات حل نہیں ہوتی ہیں۔ صوبہ سرحد کا مسئلہ پنجاب سے بھی ٹیڑھا ہے۔ لیکن نواب صاحب پر کسی کے درد یا دلیل کا اثر نہیں تھا۔ سرحدی دوستوں کا خیال تھا اگر نواب صاحب نے اجتناب نہ کیا تو وہ جماعت سے الگ ہو جائیں گے۔ یا دولتانہ سے رابطہ بڑھائیں گے۔

دولتانہ ایک پڑھے لکھے ذہین و فطین مدبر اور فہیم انسان ہیں۔ انہیں بہر حال جمہوری قدروں کا احساس تھا۔ نواب صاحب

جمہوری قدروں کو اضافی سمجتے تھے ۔ خان عبدالقیوم خاں پہلے خان لیاقت علی کے دست پناہ تھے پھر خواجہ ناظم الدین کی تلوار ہوگئے ۔ انہوں نے صوبہ سرحد کو ایک پرابلم بنا دیا ۔ اور مرکزی حکومت کے راہنماؤں کے ذہن میں یہ بات نقش کر دی تھی کہ وہ سرحد کے لئے ناگزیر ہیں - وہ سرحد سے ہٹیں گے تو وہاں پاکستان کے خلاف قیامت صغریٰ بپا ہو جائے گی۔ اس ناگزیری نے انہیں فرعون بنا دیا ۔ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتے اپنوں کو ڈراتے اور پرایوں پر غراتے تھے ۔ خان عبد القیوم نے اپنے اقتدار کو بحال رکھنے اور مرکزی حکومت پر اپنی ضرورت مسلط کرنے کے لئے چار سدہ میں سرخ پوشوں کے ایک نہتے اجتماع کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا ۔ اس حادثہ میں نہ صرف بیسیوں پٹھانوں کو گولیوں سے ہلاک کیا بلکہ بھابڑا فائرنگ کے بعد سرخپوشوں کا منہ کالا کیا انہیں گدھے پر سوار کرایا ۔ عبدالغفار خاں کے سیاسی مرکز کو ڈھا کر اس کا ملبہ نیلام کر ڈالا ۔ سارے ٹبر کو قید میں ڈال دیا ۔ قاضی عطااللہ جان اندر ہی مر گئے ۔ عورتوں کی بے حرمتی کی ۔ جو لوگ سرخپوش تحریک سے وابستہ اور سرکردہ پوزیشن کے مالک تھے انکی جائدادیں ضبط کرلیں ۔ مجھے وہ دن بھی یاد ہیں جب سات برس کے بعد بادشاہ خاں رہا ہوئے تو خان عبدالقیوم خان کا پتہ کٹ چکا تھا اور اُن کی طرف سے بادشاہ خان کوعفو طلبی کے پیغام پہ پیغام آرہے تھے کراچی کے ایک ہوٹل میں جہاں بادشاہ خان مقیم تھے خان عبدالقیوم خان موقعہ پا کر چلے گئے اور ان کے پاؤں میں بیٹھ گئے ۔ کہنے لگے ان

کے یا سرخپوشوں کے ساتھ جو سلوک ہوا اس کے ذمہ دار وہ نہیں بلکہ مرکزی حکومت کے ارباب حل و عقد تھے ۔ اُنہوں نے دو بڑے نام بھی لئے جنہیں یہاں لکھنا مناسب نہیں ۔

لاہور میں بادشاہ خان میرے مکان میں رہے ۔ خان عبدالقیوم خاں نے دو دفعہ پیغام بھیجا کہ وہ ان سے ملنا چاہتے ہیں لیکن بادشاہ خاں نے عذر کیا ۔ ڈاکٹر خان صاحب کے عہد میں خان عبدالغفار خاں کے خلاف لاہور ہائی کورٹ میں ۱۲۴ الف کا مقدمہ چلا تو جسٹس شبیر احمد کی عدالت میں خان عبدالقیوم خان نے شہادت کے دوران بھابڑہ فائرنگ سے اپنی لا تعلقی ظاہر کی ۔ اور اس قسم کا گول مول بیان دیا کہ جس کا فائدہ بادشاہ خاں کو پہنچتا تھا ۔ خان عبدالقیوم شہادت دے کر جا رہے تھے تو بادشاہ خان نے ان کے گال تھپتھپاتے ہوئے شاباش دی ۔ خان عبدالقیوم صرف اقتدار کے چنگیز تھے ۔ انہوں نے سرحد میں سرخپوشوں ہی کو ذبح نہیں کیا بلکہ لیگ کے سر بر آوردہ راہنماؤں کو بھی خوار کیا ۔ پیر مانکی شریف ان سے آخر وقت تک نالاں رہے ۔ ان کے خلاف ادنیٰ سے ادنیٰ سازش اور حرکت کی گئی ۔ خان غلام محمد خان لوند خوڑ کو صوبہ بدر کیا ۔ اور اس وقت تک واپسی کے احکام جاری نہ ہوئے جب تک خان عبدالقیوم خاں کا سنگھاسن ڈول نہیں گیا ۔ پیر زکوڑی شریف کے ساتھ بد سلوکی کا سلسلہ جاری رہا ۔ ارباب سکندر اور ارباب آصف بھی ہدف بنے رہے ۔ ارباب عبدالغفور سالہا سال جیل میں رہے ۔ خان عبدالقیوم خاں صواتی پر جھوٹا مقدمہ داغا گیا ۔ غرض عبدالقوم خاں جھوٹے مقدمے بنانے

اور سازش کا ہوا کھڑا کرنے میں ید طولیٰ رکھتے تھے ۔ ان میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ دوسرے صوبوں کی وزارتوں اور بعض مرکزی وزیروں کے خلاف بھی بے قابو زبان کے موتی لٹانے میں حیا محسوس نہیں کرتے تھے ۔ سردار عبدالرب نشتر کے خلاف گالی گفتار اپنا شیوہ بنا رکھا تھا ۔ نشتر حالانکہ شرافت کے سانچے میں ڈھل کر نکلے تھے ۔ ممتاز دولتانہ انہیں ایک آنکھ نہیں بھاتے تھے ۔ ان کے خلاف تبریٰ تولنے میں لگے رہتے ۔ نواب ممدوٹ نے اپنے انتقام یا ذوق کی تسکین کے لئے عبدالقیوم سے دوستانہ معاملہ کیا اور انہیں آمادہ کیا کہ وہ ختم نبوت کی تحریک کے جرم میں دولتانہ وزارت کو برخاست کرانے میں مرکزی حکومت پر زور دیں ۔ چنانچہ ان کی اور خواجہ شہاب الدین کی پخت وپز سے مرکزی حکومت تیار ہو گئی ۔ نتیجۃً دولتانہ وزارت کا انتقال ہو گیا ۔ نواب ممدوٹ کے لئے اس سے بڑھ کر مژدہ جانفزا اور کیا ہو سکتا تھا ۔

ختم نبوت کی جس تحریک سے خان ممدوٹ نے فائدہ اٹھا کر ممتازدولتانہ کی وزارت ختم کرنے میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کیا اس تحریک کے متعلق خود نواب صاحب کا طرز عمل یہ تھا کہ صوبہ میں اپوزیشن کے لیڈر ہو کر بھی وہ کلمۂ خیر نہ کہہ سکے ،

سہروردی نے جب دیکھا کہ ختم نبوت کی تحریک جاں سپاری کے اس عروج پر چلی گئی ہے تو مجھ سے اس تحریک کے ما لہ و ما علیہ پر گفتگو کی ۔ بارہ گھنٹوں کی لگاتار یکجائی کے بعد وہ ختم نبوت کی تحریک اور ختم نبوت کے مسئلہ پر خواجہ ناظم الدین کو ایک طویل

خط لکھنے پر تیار ہو گئے۔ انہوں نے قلم اٹھایا تو فل سکیپ سائز کے پچاس صفحے ہو گئے ۔ افسوس کہ یہ خط کتابی شکل میں ابھی تک شائع نہیں ہوا ۔ اگر شائع ہو تو انگریزی خوان طبقہ جو مسئلہ ختم نبوت کے فہم سے قاصر ہے ۔ اس سے بخوبی آگاہ ہو سکتا ہے ۔ اس خط کی اہمیت کسی طرح علامہ اقبالؒ کے تاریخی بیان ''مسلمان اور قادیانیت'' سے کم نہیں ۔ میرے پاس اس طویل خط کی کاپی تھی۔ جن دنوں انکوائری کمیشن کے اجلاس ہو رہے تھے مولانا داؤد غزنویؒ وہ کاپی مجھ سے لے گئے ۔ ان سے کسی احرار دوست نے لے لی واپس ملی تو اس کے ابتدائی چار صفحے غائب تھے ۔ پچھلا صفحہ جس پر ان کے دستخط تھے کھو چکا تھا ۔ افسوس وہ مسودہ بھی میرے کاغذات کی ویرانی میں تلف ہو گیا ۔ ہو سکتا ہے یہ عالمانہ خط ان کی بیٹی بیگم سلیمان کے پاس محفوظ ہو؟ کیوں کہ سہروردی کے تمام کاغذات ان کی تحویل میں ہیں ۔

لاہور میں مارشل لاء تھا ۔ جناح عوامی لیگ کا اجلاس شیخوپورہ میں ملک محمد انور ایڈووکیٹ کے ہاں بلایا گیا۔ نواب صاحب حسب عادت اپنے ساتھیوں سمیت دیر سے پہنچے ۔ جب ان کے سامنے سہروردی صاحب کے اس خط کا ذکر آیا اور ختم نبوت کی تحریک کے سلسلہ میں مارشل لاء کو واپس لینے ، قیدیوں کو رہا کر دینے اور میرزائیوں کو علیحدہ اقلیت قرار دینے کی قرارداد مرتب کی گئی تو نواب صاحب اور ان کے ساتھی روٹھ کر چلے گئے ۔ وہ اس کے کسی ایک شوشہ سے بھی متفق نہ تھے ۔ ان کے سامنے سارا مسئلہ دولتانہ

وزارت کے برخاست کئے جانے کا تھا ۔ غرض ختم نبوت کے اس مسئلہ پر جناح عوامی لیگ کے دو ذہن ہو گئے ۔ نواب صاحب کے ساتھیوں نے اخبارات میں پراپاگنڈا شروع کیا کہ سہروردی ختم نبوت کی تحریک کو ہوا دے کر ملک کے دشمنوں کی حوصلہ افزائی کررہے ہیں سہروردی اس قسم کے مہمل الفاظ اور غلیظ پراپاگنڈا سے کبھی نہیں ڈرتے تھے ۔ جو شخص ان سے آنکھیں پھیرنا چاہے وہ اس سے پہلے آنکھیں پھیر لیتے تھے ، لاہور پہنچ کر ہفتہ عشرہ کے وقفہ سے جاوید منزل میں جناح عوامی لیگ کی کنوینیگ کمیٹی کا اجلاس بلوایا ، نواب صاحب نے جن لوگوں کو اپنی طرف سے کنوینیک کمیٹی کا ممبر نامزد کیا تھا وہ تینوں چاروں نسلی ، عقلی اور نقلی طور پر نواب ہی تھے ، ہم جیسے فقراء کو وہ بالکل ہی نظر انداز کر گئے ۔ حالانکہ الیکشن کے زمانہ میں وہ راقم الحروف کے مکان کو دن میں کئی کئی دفعہ اپنے " قدوم میمنت لزوم " سے مشرف فرماتے تھے ۔ سہروردی نے اپنی طرف سے خواجہ عبدالرحیم ، راجہ حسن اختر ، ملک غلام نبی اور راقم الحروف کو شامل کیا ۔ نواب صاحب کو یہ بھی گوارا نہ تھا ۔ بالخصوص پہلے تین حضرات کے معاملہ میں اُن کا دل صاف نہ تھا ۔ اور اس کے وجوہ تھے ۔ پیر مانکی شریف نے نواب صاحب اور سہروردی کے درمیان سمجھوتہ کرانے کی بہتیری کوشش کی لیکن بے سود ۔ وہ رات ایک بجے تک بھاگ دوڑ کرتے رہے لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی - نواب صاحب دامن چھڑانا چاہتے اور اگر مگر لگا کر کئی کترا رہے تھے ۔ سہروردی صاحب

بھی رازہائے دروں پردہ سے واقف ہو چکے تھے لیکن اتمام حجت کر رہے تھے - نتیجہ یہ نکلا کہ نواب ممدوٹ کو دو سال کے لئے عوامی لیگ سے خارج کر دیا گیا - یہ محض ایک بہانہ تھا ورنہ نواب صاحب خود ہی ذہنی طور پر مستعفی ہو چکے تھے - میری تحریک پر سہروردی صاحب نے منیر انکوائری کمیٹی کے روبرو ختم نبوت کا مقدمہ لڑنے کا فیصلہ کیا - پیش بھی ہوتے رہے - کسی گوشہ سے بھی فیس کا ٹکا تک نہ لیا - ایکا ایکی مولانا مظہر علی اظہر احرار کی طرف سے وکیل ہو کر آ گئے - انہوں نے دس ہزار روپیہ فیس بھی لی اور قائد اعظم کے متعلق "کافر اعظم" کا اعتراف و اعادہ کر کے احرار کی پوزیشن کو بد مزہ کیا - غالباً اسی کا نتیجہ ہے کہ منیر رپورٹ میں سب سے زیادہ ملبہ احرار پر ڈالا گیا - لیکن قانون شہادت کے مسلمات سے گریز کے باوجود احرار کے خلاف جو باتیں ہرلی کے رنگوں کی طرح پھینکی جا رہی تھیں ثابت نہ ہوئیں - رہا روپے پیسے کا معاملہ تو فاضل جج الفاظ کی مینا کاری کے باوجود احرار کے خلاف اس عنوان پر قلم نہ اٹھا سکے حالانکہ اس رپورٹ میں یہ امر بالصراحت موجود ہے کہ فلاں فلاں اخبار کو تحریک ختم نبوت کے ضمن میں تعلقات عامہ کی معرفت محکمۂ تعلیم کی مدات میں سے اتنا روپیہ دیا گیا سید عطا اللہ شاہ بخاری اور ان کے رفقاً کا دامن اس آلائش سے پاک رہا - مولانا ابو الاعلی مودودی بھی ان دھبوں سے معریٰ نکلے - حالانکہ طوطا مینا اڑانے والے بہت سے تھے - خرید و فروخت کا داغ مسلم لیگ کی وزارت اور مسلم لیگ

کی صحافت ہی کے دامنوں پر رہا -

سہروردی صاحب محسوس کرتے تھے کہ پنجاب عوامی لیگ کی باگ ڈور کسی ایسے شخص کو سونپی جائے جو سلیم الطبع ہو، ذہین ہو، معاملہ فہم ہو، سیاست سے اسکی گہری دلچسپی ہو، تاریخی بصیرت رکھتا ہو، ان لوگوں پر اثر انداز ہو سکے جو اس صوبہ کے ناخدا ہیں، اور جیب و داماں کے اعتبار سے بھی خوشحال ہو، کئی نام زیر غور آتے لیکن کوئی نہ کوئی چیز مانع رہی - آخر میں نے انہیں مشورہ دیا کہ نواب زادہ نصراللہ خاں کو بلوالیں مجھ سے نواب زادہ صاحب کے جملہ کوائف پوچھے - اور راضی ہو گئے، کہا - - - - اچھا بلاؤ

اتفاق سے نواب زادہ ان دنوں صوبائی اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے کے لئے لاہور ہی میں تھے - میں انہیں سہروردی صاحب کے ہاں لے گیا - آپس میں دیر تک مبادلہ افکار ہوتا رہا، اس طرح نواب صاحب عوامی لیگ میں شامل ہو گئے - سہروردی صاحب نے بڑے اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا، مجھ سے کہنے لگے تم نے مجھے ایک شریف، قابل، سمجھدار اور جگر تاب انسان سے ملایا ہے - یہ تھا نوابزادہ صاحب سے ان کے تعلقات کا آغاز - - - -

مجھ سے سہروردی صاحب کو جو اخلاص تھا اس پر بعض تھڑ دلے اور اللٹپو لوگوں کو رشک ہی نہیں بلکہ حسد بھی تھا - اس حسد

کو طرح طرح سے ہوا دیتے - سب سے بڑا الزام میرے خلاف یہ تھا کہ میں تحریک پاکستان کے شاہی خاندان میں سے نہیں - جو الم غلم لوگ ان کے گرد بمد خوشامد جمع تھے وہ کوئی نہ کوئی شوشہ چھوڑ دیتے - لیکن سہروردی پر ان کا رتی بھر اثر نہ ہوتا - ایک روز ان کی موجودگی میں ایک ایسے نوجوان نے جس کی بے نظیر خوبیوں کے تذکرے کا متحمل یہ قلم نہیں ہو سکتا ہاتھا پائی کا انداز اختیار کیا - میں ذکی الحس انسان ہوں - بسا اوقات پھول کی پتی بھی میرے دل میں آگ اگا دیتی ہے - میں وہاں سے اٹھا اور گھر آ گیا - سہروردی صاحب نے روکنا چاہا لیکن میں غصہ میں ڈھلا ہوا نکل آیا - مجھے بہت سے فون کئے لیکن میرا دل کچھ ایسا کھٹا ہو چکا تھا کہ علیحدگی ہی کو غنیمت سمجھا - ان کے پیار کا یہ حال تھا کہ میرے گھر میں بارہا تشریف لائے - میری اہلیہ سے کہتے رہے اس کو راضی کرو - میرے بچوں کو پچکارتے رہے لیکن میں ذہنی طور پر دستبردار ہونے کا فیصلہ کر چکا تھا -

سہروردی صاحب کو جس چیز کا اعتراف و احساس تھا وہ گوجرانوالہ کا جلسہ عام تھا - اس جلسہ میں پچاس ہزار سے کیا کم آدمی ہوں گے لوگوں کو ختم نبوت کی تحریک کے حشر کا صدمہ تھا اور غصہ بھی - انہوں نے سہروردی کی تقریر سننے سے انکار کر دیا - تمام منتیں بیکار گئیں - حتیٰ کہ پہلوانوں کے اس شہر نے ننگا ہو کر ناچنا شروع کیا - سہروردی صاحب حیران تھے کہ لوگ بات کیوں نہیں سنتے ؟ میں تاخیر سے پہنچا - دیکھا طوفان برپا ہے - نوجوان

بھنگڑا ڈال رہے ہیں - میں نے فوراً ہی اسٹیج کا رخ کیا لیکن لوگ اور بپھر گئے - گالیوں پہ گالیاں - بولیوں پہ بولیاں - پھبتیوں پہ پھبتیاں - ہم نہیں سنتے چلے جاؤ تم سب غدار ہو - ختم نبوت کے شہدا کا قصاص دو - ان کے خون کا ذمہ دار کون ہے ؟ گویا یہ سب ہمارے ذمہ تھا اور ہمیں اس کے محرک ہوئے تھے - حالانکہ ہم نے تحریک کی حمائت کی تھی مردہ باد کے نعرے ہمارے کانوں کو پھاڑ رہے تھے - پتھراؤ بھی شروع ہو گیا - سہروردی صاحب کرسیٔ صدارت پر ڈٹ کر بیٹھے رہے - میں سٹیج پر کھڑا رہا - میں نے اعلان کیا کہ جس وقت تک آپ تقریر نہیں سنیں گے اس وقت تک جلسہ برخاست نہیں ہوگا - اور نہ ہم لوگ جائیں گے - جس ختم المرسلین کے نام پر شہید ہونے والوں کے خون کا قصاص قاتلوں کی بجائے آپ ہم سے مانگ رہے ہیں ہم بھی اُسی ختم المرسلین کی منت میں آپ کے پتھر کھائیں گے اور اگر آپ کے ہاتھوں موت آ گئی تو ہم اعلان کرتے ہیں کہ ہمارا خون آپ کو معاف ہے - اس کا کوئی قصاص نہیں - بھڑکا ہوا مجمع قدرے ٹھہر گیا - صرف پندرہ منٹ کی تقریر کے بعد لوگوں کے جوش خروش کا یہ حال تھا کہ جن زبانوں پر ابھی سہروردی مردہ باد تھا وہ فلک شگاف آوازوں میں سہروردی زندہ باد پکار رہی تھیں - مجھے یاد ہے سہروردی نے اس تقریر کے بعد کہا تھا شورش زندہ باد تم نے مجھے ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے -

غرض جس محبت اور اخلاص کا مجسمہ سہروردی تھے وہ انہی پر ختم ہو گیا اور یہ ان کے دل کی بے پناہ صداقتوں کا ایک پہلو تھا -

---

مقدمہ سازش راولپنڈی کے ملزموں نے انہیں اپنا وکیل کر لیا اور وہ ان کی پیروی کے لئے سپیشل کورٹ میں پیش ہونے کے لئے حیدر آباد چلے گئے جہاں عرصہ تک رہے پھر جس قابلیت، محنت، تندہی، شوق اور عبقریت سے مقدمہ لڑا اُس کا اعتراف فیض احمد فیض کا وہ قصیدہ ہے جو اُنہوں نے ہدیۂ سپاس کے طور پر پیش کیا اس خصوصی عدالت کے چیف جسٹس سر عبدالرحمٰن تھے۔ سہروردی ان کے متعلق کبھی خوش رائے نہ تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ پشتینی وفاداروں میں سے ہیں۔ وہ ان کے متعلق عدالت میں بیٹھ کر بھی کھسر پھسر کرتے اور عدالت سے باہر بھی مزے مزے کے لطیفے سناتے۔ کسی نے سر عبدالرحمٰن کو مخبری کر دی۔ ایک دن عدالت کی کارروائی شروع ہونے سے پہلے سر عبدالرحمٰن نے مخاطب ہو کر کہا۔

مسٹر سہروردی! سنا ہے کہ آپ عدالت پر نکتہ چینی کرتے ہیں؟

سہروردی تاڑ گئے۔ پلٹ کر سوال کیا۔ عدالت میں یا عدالت سے باہر۔ سر عبدالرحمٰن بھانپ گئے کہ بے ڈھب انسان ہے مبادا کوئی گل کھلے! کارروائی شروع کرنے کے لئے کہا اور کارروائی شروع ہوگئی۔

سہروردی قانون کے ایچ پیچ میں زیادہ نہیں جاتے تھے ان کے بحث کرنے اور سوال اٹھانے کا طریق اتنا دلفریب تھا کہ فاضل جج

عش عش کر اُٹھتے - انہوں نے ساری عمر سیاسیات میں گنوا دی اگر وہ سیاسیات میں نہ ہوتے تو عین ممکن تھا کہ قانون میں ایک شخص بھی ان کا ہم پایہ نہ ہوتا - وہ جامع الصفات تھے - سیاست ان کی لونڈی اور قانون ان کی رقاصہ تھی - وہ جس مقدمہ کو ہاتھ میں لیتے اس میں شاذ ہی ہارتے - روپیہ ان پر عاشق تھا - وہ کما کر رکھنا اپنی ذہانت کی توہین سمجھتے تھے - وہ حد درجہ فیاض تھے جو کماتے لٹا دیتے - ان میں نام کو بھی بنیا پن نہ تھا - عام طور پر ان کی فیس ان کے ساتھی یا نائب وکلاء وصول کرتے تھے - جو حساب ان کو پیش کیا جاتا قبول کر لیتے - کبھی مین میخ نہ نکالتے - کسی کی دیانت پر شبہ نہ کرتے - یہ جانتے ہوئے بھی بعض نائبین نے ان کے روپے کو ضائع کر دیا ہے یا اس میں کچھ اور خرابی پیدا کر لی ہے وہ روپیہ پیسہ کے معاملہ میں جھگڑا تو ایک طرف رہا ملال بھی نہ لاتے تھے - اُن کا دل آئینہ تھا جو کچھ لاہور میں کماتے لاہور ہی کے ورکروں پر خرچ کر دیتے جو کراچی میں کماتے وہاں خرچ کر آتے اپنے لئے بہت کم پس انداز کرتے تھے - بے شمار روپیہ کمایا - وکالت ان کے لئے بن برساتی تھی لیکن فیس آئی اور بٹ گئی - عوامی لیگ پر پانی کی طرح روپیہ بہایا - مشرق پاکستان کے ارکان آتے تو ان سے کرائے کے علاوہ وظائف بھی لے جاتے - وہ سب کے بابا تھے اور اپنے بالکوں کو روپیہ دے کر خوش ہوتے - کئی ،ستحقین کا وظیفہ لگا رکھا تھا - انہیں ہر ماہ منی آرڈر بھجواتے اکثر ایسا ہوا کہ لاہورمیں مقدمہ لیا - دس بارہ ہزار فیس آئی - اتنے میں

کوئی واقف کار ضرور تمند آ گیا - یا جماعت کے لئے کسی معتقد نے روپیہ طلب کر لیا یا کسی کارکن کو ذاتی ضرورت پڑ گئی وہ کرایہ وضع کر کے سارا روپیہ ان کے حوالہ کر دیتے۔ بسا اوقات کرایہ کے لئے خواجہ عبدالرحیم سے ٹکٹ کے پیسے اُدھار لے کر کراچی جاتے - لطف کی بات یہ ہے کہ وہ اپنے دشمنوں کی بھی مدد کرتے تھے - میں ایک ایسے نامور شاعر کو جانتا ہوں جو سر راہ مل گیا - وہ ان دنوں مختلف روزناموں میں ان کے خلاف شاعرانہ نوک جھونک کرتا تھا - اس کو موٹر میں بٹھا کر ساتھ لائے - دیر تک اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے - کہنے لگے کیا کرتے ہو ؟ اس نے کہا - ''اخبارات میں قلم گھسا کر روٹی کھاتا ہوں ؟ کوئی مستقل ذریعہ معاش نہیں تھوڑی سی زمین ہے لیکن نو من تیل نہیں کہ رادھا ناچے -بیلوں کی جوڑی دو ہزار میں آتی ہے ؟

فوراً ہی جیب سے دو ہزار روپے نکالے - اس کے حوالے کئے اور کہا جاؤ زمین پر ہل جوتو - پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ؟ اس معمولی رقم کا انتظام تو ہر وقت ہو سکتا تھا - ان کے نام پر بعض کارکنوں نے کافی روپیہ جمع کیا - لیکن یہ ان کے علم میں نہیں تھا خود ہی جمع کیا خود ہی گلچھرے اُڑائے - کمزوری کہہ لیجئے یا خرابی - کہ وہ ان لوگوں کو سختی سے روک نہیں سکتے تھے - ٹوکتے ضرور تھے لیکن منت سماجت کرنے پر معاف کر دیتے تھے- جس زمانہ میں وزیر اعظم تھے عوامی لیگ کے لئے فنڈ جمع کرنے کا انتظام کیا - لیکن اس رقم کو خود ہاتھ نہیں

لگایا۔ بلکہ وہ روپیہ ان کے دو سرکاری معتمدوں کے پاس رہا۔ چونکہ ایک غلط شخص کا غلط انتخاب کیا تھا ۔ لہذا روپیہ کا صحیح استعمال نہ ہو سکا بعض بد دیانت افراد نے ڈکار لیا ان کا ذکر چھڑا تو فرمایا ۔

'' بھائی ، اس ملک میں فرشتے کہاں سے لاؤں ؟ سبھی لوگ میری رسوائی کا سر و سامان کرتے ہیں ؟

میں نے کہا یہ بات نہیں آپ کے ساتھ بہت سے دیانتدار افراد بھی ہیں ۔ ان کی خدمات سے فائدہ کیوں نہیں اٹھاتے ؟

کہنے لگے ، میں تو سبھی لوگوں کو دیانتدار سمجھ کر کام پر لگاتا ہوں لیکن وہ ہاتھ صاف کر جاتے ہیں ۔ انہیں ایک خاص آدمی کے متعلق بہت رنج تھا جو سکندر میرزا کی طرف سے ان پر جاسوس مقرر تھا - اور ان کا عہدیدار بھی تھا ۔ آفتاب ان کے جاں نثار سکریٹری تھے ۔ اس سے انہیں قلبی لگاؤ تھا ۔ ایک روز دونوں بیٹھے تھے میں بھی پہنچ گیا ۔ ہم تینوں اکٹھے ہو گئے ۔ دیر تک بعض لوگوں کی کم مائیگی کا ماتم کرتے رہے ۔ ان میں عفو و در گذر کا مادہ عام تھا ۔

ایک روز میں نے انہیں کسی قدر پریشان پایا سبب پوچھا کہنے لگے سکندر میرزا نے مجھ سے کہا ہے تم ملک کے وزیر اعظم ہو ۔ اپنے ساتھ با عزت لوگ رکھو ۔ بعض کارکن پرائم منسٹر ہاؤس کی آڑ میں کاروبار کرتے ہیں ۔ پھر انہوں نے ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیوریو

کی ایک خفیہ رپورٹ دکھائی جس میں عوامی لیگ کے بعض ارکان کی بابت بعض شرمناک الزام موجود تھے۔ کہ انہوں نے میٹروپول ہوٹل میں کرایہ پر مستقلاً کمرے لے رکھے ہیں۔ اور آپ کے نام پر مختلف قسم کے گل کھلا رہے ہیں۔؟ وہ ان لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے۔ سخت جھاڑتے۔ برا بھلا کہتے۔ کئی کئی دن منہ نہ لگاتے لیکن نکال نہیں سکتے تھے یہ ان کی کمزوری کہہ لیجئے یا فیاضی۔

مغربی پاکستان سے پہلی دفعہ وہ اس وقت مایوس ہوئے تھے جب خواجہ ناظم الدین کے عہد میں دونو صوبوں کے درمیان ملازمتوں کے سوال پر آئین میں امتیاز رکھا گیا اور لاہور میں پنجاب کی حق تلفی کے نام پر موچی دروازہ کے باہر ایک جلسۂ عام ہوا۔

سہروردی صاحب کا خیال تھا کہ اول تو ملازمتوں کی اس طرح خانہ بندی ہی غلط ہے۔ دوم مغربی پاکستان کے زعماءٔ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اصولوں کی بنیاد پر مشترکہ پارٹیوں کا قیام مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے اختلاف ختم کر سکتا ہے۔ ان کے نزدیک مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے حقوق کا تعین پاکستان کی وحدت کے لئے خطرناک تھا۔ وہ اس خیال کے تھے کہ ایک ملک میں کئی جمہوری پارٹیاں اپنے اپنے پروگرام کی بنیاد پر اس امتیاز و تفریق کو مٹانے میں ممد ہو سکتی ہیں۔ لیکن انہی کے الفاظ میں چونکہ مغربی پاکستان میں کوئی ایسا رہنما نہیں تھا جو

مشرق پاکستان میں جا سکے اور وہاں کے لوگوں سے سیاسی طور پر ہم کلام ہو۔ اس لئے ان زعماءُ نے ملک کو مغربی پاکستان اور مشرق پاکستان میں تقسیم کر دیا تھا

مشرق پاکستان کے انتخابات جیت کر سہروردی مغربی پاکستان میں آئے تو اصولاً مغربی پاکستان کے حکمران زعماءُ کو ان سے بات چیت کرنی چاہئے تھی لیکن انہوں نے پاکستان کے سفیر مسٹر محمد علی بوگرہ کو امریکہ سے بلوا کر وزیر اعظم بنا دیا یہ مشرق پاکستان کے منہ پر ایک سنگین طمانچہ تھا۔ صوبہ میں تو ان کی وزارت بن گئی لیکن مرکز میں نظر انداز کر دیا ۔ اس سے پہلے خواجہ ناظم الدین کو سازش کر کے برخاست کیا جا چکا تھا ۔ بہر حال یہ گاڑی زیادہ دیر تک نہ چل سکی ۔ سہروردی کو کابینہ میں وزیر قانون کی حیثیت سے لینا پڑا ۔ اپنے ہی ایک سیاسی لے پالک محمد علی بوگرہ کی وزارت میں سہروردی نے وزیر قانون بننا کیوں پسند کیا ؟ یہ وزیر اعظم بنانے کے حتمی وعدے کا پیش خیمہ تھا۔

پنجاب میں ختم نبوت کے مارشل لا' کا ایک قیدی موت کی سزا میں ابھی تک محبوس تھا ۔ جیل والوں نے چیف سکریٹری سے پوچھا کہ باقی سب رہا ہو چکے ہیں اس کے متعلق کیا فیصلہ ہے؟ اس وقت صوبہ میں لاہوری جماعت کے احمدی مسٹر فاروق چیف سکریٹری تھے۔ انہوں نے پھانسی لگا دینے کے احکام جاری کر دیئے ۔ جیلر نے خبر حمید نظامی کو پہنچائی ۔ حمید نظامی نے مجھ سے ذکر کیا ، میں نے اصرار

لیڈروں کو کہلا بھی بھیجا وہ اس وقت سہروردی کے ساتھ تھے - ادھر عوامی لیگ جناح اور مسلم کے الفاظ حذف کر کے صرف عوامی لیگ رہ گئی تھی - ایک احرار لیڈر نے فوراً ہی سہروردی صاحب کو کراچی فون کیا - ادھر میں نے بھی ایک دوست کی معرفت کہلوایا کوئی گھنٹہ بعد سہروردی صاحب نے مطلع کیا کہ قیدی مذکور کی سزائے موت موقوف کر کے رہائی کے احکام جاری کر دئے گئے ہیں انہی دنوں انہوں نے اخبار نویسوں کی انجمن کے سالانہ اجتماع کو کراچی میں خطاب کیا - آمنا سامنا ہوا تو مجھے اجلاس سے اٹھا کر ساتھ لے گئے - دیر تک حالات کے مختلف پہلوؤں پر گفتگو کرتے رہے - کہنے لگے عوامی لیگ میں کیوں نہیں آتے ہو؟ اتنی لمبی ناراضی یا علیحدگی کا مطلب کیا ہے؟ عرض کیا احرار کا ایک گروپ آپ کو مل گیا ہے - اس سے کام لیجئے - فرمایا اصل لوگ تو آئے نہیں - سید عطا اللہ شاہ بخاری اور قاضی احسان احمد کنارہ کش ہیں - ماسٹر تاج الدین ہوشیار آدمی ہیں - لیکن بوڑھے ہو چکے ہیں - ایک دوسرے احرار راہنما کا نام لیا کہ ان کی تقریر نے مجھے بالکل متاثر نہیں کیا - وہ خطابت میں گلی ڈنڈا کھیلتے ہیں - پھر لاہور کے ایک جلسہ کا ذکر کرنے لگے جس میں پبلک نے ہلڑ بازی کی تھی اور احرار کے اس لیڈر نے میرا اور حمید نظامی کا نام لے کر الزام لگایا تھا کہ اس کے ذمہ دار یہ دونو ہیں - میں نے عرض کیا -

”تو کیا آپ نے ان کے ارشاد پر اعتبار کر لیا ؟“

فرمایا -

"بالکل نہیں مجھے معلوم تھا کہ وہ تمہارے بارے میں خاص قسم کے ذہنی مرض کا شکار ہیں۔

میں نے کہا۔ بعض لوگ فطرتاً اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ وہ غالباً آپ پر اپنی تقریر کی دھاک بٹھانا چاہتے تھے۔ موقع غنیمت سمجھا اور ترنگ میں اس الزام پر آ گئے۔

کہنے لگے۔ میں نے اس وقت بھی انہیں ٹوکا تھا کہ نام لینا مناسب نہیں۔ لیکن وہ بیان کے زور میں بہہ گئے تھے۔

میں نے عرض کیا۔ چلئے اس پر خاک ڈالئے۔ داغ کا ایک شعر ہے ------

جب کوئی فتنہ زمانہ میں نیا اٹھتا ہے
وہ اشارے سے بتا دیتے ہیں۔ تربت میری

لاہور میں جب کوئی سیاسی ہنگامہ ہو۔ میرا اور حمید نظامی کا نام ضرور آتا ہے

پورا ہو چکا تھا لیکن انکی اپنی طاقت صرف تیرہ ممبروں پر مشتمل تھی وہ عملاً بے بس تھے ۔ اور ان لوگوں کے ہاتھ میں تھے جو اپنے وزیر اعظم کی بہ نسبت اسکندر میرزا کے وفادار تھے ۔ اور اس کے اشارۂ ابرو پر لٹو کی طرح گھومتے تھے ۔

میں عوامی لیگ میں دوبارہ شامل نہیں ہوا تھا ۔ بلکہ جب سے سہروردی وزیر اعظم ہوئے ان سے ملا ہی نہیں تھا ۔ حمید نظامی بھی ان سے نہیں ملے تھے ۔ مجھے احساس تھا کہ اس وقت ان کے گرد جو لوگ جمع ہو گئے ہیں ۔ وہ ان کے نہیں وزیر اعظم کے گرد جمع ہیں ۔ ہم روزمرہ کے دوست کسینو میں بیٹھے گپ بازی کر رہے تھے کہ منیجر نے حمید نظامی سے کہا گورنر ہاؤس سے آپ کا فون آیا ہے ۔ نظامی صاحب نے فون سنا تو سہروردی بول رہے تھے ۔

س ۔ " بھئی آپ سے ملنا ہے چلے آؤ ۔ جب سے ہم وزیر اعظم ہوئے ہیں آپ نے ملنا ہی چھوڑ دیا ہے "

ح ۔ " میں اس وقت تو نہیں آ سکتا کیونکہ معمول کے مطابق دوستوں کی محفل لگی ہوئی ہے ۔ البتہ دو گھنٹے کے بعد آ سکوں گا "

س ۔ ابھی چلے آؤ

ح ۔ میں دو گھنٹہ بعد ہی آ سکتا ہوں ۔

س ۔ وہاں کون کون ہے ؟

ح ۔ دوستوں کے نام لئے ۔

س ۔ تو شورش کو بھی ساتھ لے آؤ بہت دن سے خفا ہے ۔

ح ۔ میں اسے نہیں کہہ سکتا ۔ آپ اسے خود کہہ دیں ۔

س ۔ اچھا تو آپ چلے آؤ

ح ۔ میں دو گھنٹہ بعد حاضر ہو رہا ہوں ۔

اس رات میں سو رہا تھا ۔ گیارہ بجے فون کی گھنٹی بجی میں نے فون اٹھایا تو خود سہروردی تھے ۔

" بھئی کیا کر رہے ہو ۔

" سو رہا ہوں "

" فوراً چلے آؤ "

" جناب رات کافی بیت چکی ہے ۔ صبح سہی "

" نہیں ابھی آ جاؤ "

" مجھے عذر نہیں لیکن اس وقت گھر میں اکیلا ہوں ۔ میرے پاس کوئی سواری بھی نہیں ہے ،

" میں موٹر بھیج دیتا ہوں "

" جی نہیں صبح جس وقت آپ فرمائیں آ جاؤں گا "

" تو پھر صبح ساڑھے سات بجے چلے آؤ اور چائے یہیں پیو "

" تعمیل ہو گی ! "

میں گورنمنٹ ہاؤس پہنچا تو وزیر اعظم سہروردی کے ٹھاٹھ ہی

اور تھے۔ چاروں طرف خفیہ پولیس کا پہرہ تھا پولیس کے حفاظتی دستے چاق و چوبند کھڑے تھے۔ سہروردی مجھے دیکھتے ہی چمٹ گئے۔ اتنے میں ان کا عملہ فعلہ آ گیا۔ میں چائے پی کر ان کے بستر پر لیٹ گیا۔ کہنے لگے "کیا نیند آ رہی ہے؟" جی نہیں نیند تو پوری کی ہوئی ہے وزیر اعظم کے بستر پر لیٹا ہوں تا کہ خوش ہو سکوں۔ وزیر اعظم کی کرسی نہ سہی بستر ہی سہی۔ بہت ہنسے۔ عام سیاسی کچرے سے ایک طرف لے گئے۔ "بھئی اب تو عوامی لیگ میں چلے آؤ" گلے لگا لیا۔ گھنٹہ بھر زور دیتے رہے جیسے باپ بیٹے پر زور دیتا ہے۔

میں نے عرض کیا۔

مجھے عوامی لیگ میں شامل ہونے سے انکار کیا۔ آپ کے ساتھ رہ کر سیاسی کام کرنا عزت کا باعث ہے۔ لیکن یہاں جو لوگ اس وقت بلکہ شروع سے آپ کے ساتھ ہیں ان کی اکثریت بڑی خطرناک ہے۔ آدمی ان سے عزت نہیں بچا سکتا۔

فرمایا، مجھے احساس ہے۔ لیکن وہ شخص جس سے تمہیں رنج ہے اس نے ہمیشہ اپنے کئے پر ندامت کا اظہار کیا۔ اور یہی چاہا کہ تم کسی طرح چلے آؤ۔

میں نے عرض کیا۔

"وہ بات تو اب کئی سال پرانی ہو چکی۔ میں اس کو بالکل بھول گیا ہوں۔ میری مراد اس شخص سے نہیں۔ میں ان لوگوں کے متعلق کہہ رہا ہوں جو اس کچھار میں شیر کی طرح چنگھاڑتے

اور چیتے کی طرح دھاڑتے ہیں"

فرمایا، تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔ یہ لوگ نہ شیر ہیں نہ چیتا۔ یہ تو گھاؤ گھپ ہیں۔ انہوں نے عوامی لیگ کی عزت کو بٹہ لگا رکھا ہے۔ کل ہی یہ لوگ یہاں گورنر ہاؤس میں ایک دوسرے کا گریبان پھاڑ رہے تھے۔

اتنے میں اس طائفہ کے ترپ کا اِکہ آ گیا۔ مجھے موجود پایا تو اس کا رنگ فق ہو گیا۔ چھٹتے ہی کہا۔

"تم کہاں؟ کیوں آئے ہو خیریت ہے؟"

"بابا نے یاد کیا تھا۔ سلام کرنے حاضر ہو گیا ہوں؟"

بابا اس کے تیوروں سے بھانپ گئے کہ اسے میرا آنا کھٹکا ہے۔ انہوں نے ذرا ترش لہجہ میں کہا باہر چلو میں شورش سے بات کر رہا ہوں۔ وہ باہر چلا گیا۔ بابا نے کہا۔

"شورش باور کرو میرے دل میں تمہارے لئے محبت بھی ہے اور عزت بھی۔ لیکن ان لچوں کو تمہارا آنا پسند نہیں۔ یہ میرے گرد و پیش رہ کر اپنی دوکانداری قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ میں اس وقت ریپبلیکن پارٹی کی اکثریت سے وزیر اعظم ہوں۔ باہر بھی عوامی لیگ نہیں۔ حمید نظامی بھی اِن عناصر سے خفا ہیں۔ رات یہی کہتے ہوئے گئے ہیں۔ ذرا مطلع صاف ہو جائے اور مجھے یقین ہو کہ سال دو سال مجھے وزارت کرنا

ہے تو میں اس عنصر کو نہ صرف ٹھکانے لگا دوں گا بلکہ ایسا سبق دوں گا کہ انہیں انسان بننے کا سلیقہ آ جائے گا"

مجھ سے پھر چمٹ گئے - میری پیشانی کو بوسہ دیا - معاً ملٹری سکریٹری نے انہیں مطلع کیا کہ پریذیڈنٹ دس بج کر تیس منٹ پر پشاور سے آ رہے اور ہوائی اڈے سے سیدھے کراچی جا رہے ہیں - وہ تیاری کرنے لگے - اور آدھ گھنٹہ میں تیار ہو کر ہوائی اڈے کو چلے گئے - صدر سے مل کر لوٹے تو بہت مطمئن تھے مجھے تخلیہ میں لے گئے - فرمایا -

"ون یونٹ کی حمایتی مہم جو میں نے شروع کی ہے ریپبلیکن پارٹی کو اس سے اختلاف ہے صدر واضح الفاظ میں مجھے کہہ گئے ہیں کہ مہم جاری رکھو - رکنے کی ضرورت نہیں - ریپبلیکین پارٹی کے جو لوگ مخالفت کر رہے ہیں میں انہیں ٹھیک کر دوں گا - - - - "

گفتگو کا رخ موڑتے ہوئے کہا میں آج لائل پور جا رہا ہوں وہاں پبلک جلسہ ہے - ساتھ چلو گے -

" میں نے معافی چاہی لیکن وعدہ کیا کہ تھوڑے دنوں بعد کراچی حاضر ہو کر اپنے فیصلہ سے مطلع کروں گا - معانقہ کر کے باہر نکلا تو گرمانی صاحب جو اس وقت گورنر تھے نظر پڑے - اپنے ساتھ دفتر میں لے گئے - ان سے معلوم ہوا کہ سکندر میرزا ریپبلیکین وزراء میں ایک صاحب کو کہہ گئے ہیں -

" سہروردی کے جلسے نہیں ہونے چاہیں' - مغربی پاکستان کے
عوام سے خطاب کرنے کا اسے کوئی حق نہیں - ریپبلیکین پارٹی
کا میدان عوامی لیگ کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہیئے -

میں حیران رہ گیا - گرمانی صاحب سے کہا سہروردی کو مطلع کر دیں سکندر میرزا انہیں کچھ اور ہی کہہ گیا ہے ادھر میں نے سہروردی کی روایت بیان کی تو وہ انگشت بدنداں رہ گئے - مہاراجہ رنجیت سنگھ اور میراثی کے مشہور لطیفہ کا ذکر کیا کہنے لگے ایک میراثی مہاراجہ رنجیت سنگھ کے دربار میں گیا اور عرض کی -

" مہاراج کل رات آپ کے باپو خواب میں آئے تھے - اداس
تھے کہ میرا بیٹا خیرات نہیں کرتا - مجھ سے کہا مہاراج کے
پاس جاؤ اور کہو کہ تمہیں ایک سو اشرفی دے دے "

رنجیت سنگھ تاڑ گئے - کہنے لگے -

" دادا ! باپو مجھے بھی رات خواب میں ملے تھے اور
تمہاری شکل دکھائی تھی کہ یہ شخص کل صبح تمہارے پاس
آئے گا اور میرا نام لے کر جھوٹ موٹ ایک سو اشرفی مانگے
گا اسے سو جوتے مارنا "

میراثی نے ہاتھ باندھ کر عرض کی

" مہاراج عجیب انسان ہیں باپو - آپ سے یہ کہہ گئے اور

مجھ سے وہ کہا تھا ۔ میں نے سہروردی صاحب سے لطیفہ بیان کر کے اصل حالات سے مطلع کیا ۔ تو وہ ہش کرنے لگے ۔ گرمانی صاحب کو بلوایا وہ آ گئے میں آٹھ کے گھر آ گیا پھر جانے ان سے کیا باتیں ہوئیں ؟

انسانی فطرت بھی عجیب ہے ۔ گھر پہنچا تو فون پہ فون آ رہے تھے ۔ سہروردی صاحب سے کیا مفاہمت ہوئی ۔

میں نے کہا مفاہمت دو برابر کے آدمیوں میں ہوتی ہے ۔ میں ان کا خورد ہوں ۔ میری ان سے مفاہمت کیا ؟ ان کی شفقت ہے کہ ملتفت رہتے ہیں ۔

اس دوغلی صورت حال کے باوجود سہروردی دورے پر چلے گئے ۔ جہاں گئے پبلک کے بڑے بڑے اجتماع سے خطاب کیا ۔ اور ون یونٹ کی حمایت پر کمر بستہ رہے ۔ ون یونٹ کی حمایت وہ کسی وزارتی مصلحت کے تحت نہیں کرتے تھے ۔ وزارتی مصلحتیں ان کی طبیعت کے منافی تھیں ۔ وہ عقیدۃً ون یونٹ کے حمایتی تھے ۔ اُنہوں نے ہی وزیر قانون کی حیثیت سے قومی اسمبلی میں بل پیش کیا تھا ۔ اکثر لوگوں نے ان سے کہا کہ وہ مشرقی پاکستان کے ہیں انہیں مغربی پاکستان کی وحدت سے کیا دلچسپی ہے ؟ یہ تو مشرقی پاکستان کی سالمیت کا جواب ہے ۔ لیکن ان کا ایک ہی جواب تھا کہ پاکستان میں صوبائی کھڑاگ سرے سے غلط ہے ۔ جن صوبوں کو آپ لوگ باقی رکھنا چاہتے ہیں وہ کوئی الہامی کتاب نہیں کہ ان سے

منحرف ہو کر ایمان میں خلل واقع ہو جائے گا - ون یونٹ اس ملک کے استحکام و انضباط کی طرف ایک مدبرانہ اقدام ہے - اگر مشرقی پاکستان ہی کو ملحوظ و مقدوم رکھا جائے اور میں اس انداز میں سوچوں تو یہ قومی غداری ہو گی اس طرح مشرقی پاکستان کے لوگ کسی ایک صوبہ سے سمجھوتہ کر کے سارے مغربی پاکستان کو خراب کر سکتے ہیں - مرحوم ماضی میں یہی ہوتا رہا ہے - اور اسی کی وجہ سے ملک میں گونا گوں مسائل پیدا ہوئے ہیں - ون یونٹ ان سب خرابیوں کا قلع قمع کرتا ہے جو لوگ اس وحدت کو توڑنے کے درپے ہیں وہ دور اندیش نہیں - ان کے حزبی ، نسلی اور صوبائی مفاد ہیں اور وہ ان کی خاطر ملک کی سیاسی آب و ہوا کو مکدر کر رہے ہیں - اس وحدت کے بے شمار تہذیبی ، سیاسی ، ثقافتی اور اقتصادی فوائد ہیں - اس سے فی الواقعہ ایک پاکستانی قوم تیار کرنے میں مدد مل سکتی ہے - بشرطیکہ ہم خود بھی تیار ہوں اور جو لوگ مغربی پاکستان کے سابقہ صوبوں سے ہیں وہ خوش دلی سے زندگی گذارنے کا تہیہ کر لیں -

۱ - ون یونٹ پاکستان کے دونو صوبوں میں سیاسی توازن پیدا کرنے کی ایک مشکور کوشش ہے -

۲ - ون یونٹ ان لسانی عصبیتوں اور صوبائی خرابیوں سے بچاتا ہے جن سے نظریۂ پاکستان کی نفی ہوتی ہے -

۳ - ون یونٹ میں پاکستانی ملت کے مل جل کر نشو و نما پانے کے امکانات روشن و آشکار ہیں -

۴- ون یونٹ بالاخر ایک خوشگوار ثقافتی وحدت کو جنم دے سکتا ہے -

۵- ون یونٹ ایک قوم کو اُجالنے اور اٹھانے میں بہ غایت درجہ ممد و معاون ہو سکتا ہے -

۶- ون یونٹ کی سیاسی وحدت بالآخر ملی وحدت کا ذریعہ بن سکتی ہے -

۷- ون یونٹ انتظامی اعتبار سے بڑا مفید ثابت ہو سکتا ہے - بشرطیکہ جن لوگوں کے سپرد اس کا انتظام ہو وہ تعصبات سے خالی الذہن ہوں اور اس امر کا تہیہ کر لیں کہ انہیں صوبائی عوام کی خاطر نہیں بلکہ ملکی عوام کے لئے کام کرنا ہے -

۸- ون یونٹ میں سرکاری اخراجات بو قلموں قسم کے بوجھ سے نجات حاصل کر کے مقابلۃً کمتر ہو جاتے ہیں -

۹- ون یونٹ میں وزارتوں کی عیاشی معدوم ہو جاتی ہے -

۱۰- ون یونٹ میں سارے ملک کی ترقیاتی سکیموں کو وحدت کے مشترکہ ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی آسانی حاصل ہو جاتی ہے -

لیکن سہروردی کے ان دلائل کا اثر کن پر ہوتا ؟ جن کے ساتھ وزارت عظمیٰ پر فائز تھے وہ ان کی پیٹھ میں خنجر گھونپ رہے اور ہر ممکن عقبی وار سے وحدت کو توڑنے کے درپے تھے - ان کی زبانیں دوغلی تھیں - ان کے کردار چھانگے تھے - ان کی مصلحتوں کا مرغ باد نما

ہوا کے رخ پر تھا ۔ وہ سیاسیات میں حادثہ کے طور پر آئے تھے ۔ ان میں حصول اقتدار کے سوا اور کوئی جذبہ کار فرما نہ تھا ۔ وہ ان لوگوں میں سے تھے جن کی بلندیوں پر پستیاں قہقہے لگاتی ہوئی گذر جاتی ہیں ۔ جن سے کسی اصول کی توقع نہیں کی جا سکتی پاکستان کے سب سے بڑے سانحہ کا نام ریپبلیکین پارٹی تھا ۔ اس کے ارکان ان تماش بینوں کی طرح تھے جو بھنورے کی طرح زندگی گذارتے اور جس پھول میں رس ہوتا اسے چوس کر پھر سے اُڑ جاتے ہیں ۔

جب کبھی پاکستان کی صحیح تاریخ لکھی گئی ریپبلیکن پارٹی کا باب سیاہ حاشیہ سے لکھا جائے گا ۔ اس کے عمر و عیار سکندر میرزا نے ملک کے ساتھ جو سلوک کیا قوم کو جس طرح داؤں پر لگایا ۔ پھر جس آزادی کو لوگوں نے طویل جد و جہد کے بعد حاصل کیا تھا اس کو اس سیاسی راہزن نے جس طرح اغوا کیا وہ ایک ایسا المیہ ہے کہ تاریخ انسانی اس عجیب الخلقت انسان کو کبھی معاف نہیں کر سکتی ۔ بلکہ اس کی موت پر اس کے مزار پر یہ کتبہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس قبر میں وہ شخص سو رہا ہے جس نے انگریزوں کے خود کاشتہ پودے کی حیثیت سے پاکستان میں نشو و نما پائی اور جس آزادی کو مسلمانان پاکستان نے طویل جد و جہد کے بعد حاصل کیا تھا اس نے اسے داؤں پر لگا دیا ۔ حتیٰ کہ پاکستانی عوام کے لئے زنجیروں کا ایک ایسا حلقہ مہیا کر گیا کہ نظر بہ ظاہر اس کے لئے ایک اور تھکا دینے والی جد و جہد درکار ہے ۔

سہروردی ابھی سفر ہی میں تھے کہ امریکن کونسلیٹ نے مل کر انہیں صورتحال کی تازہ کروٹوں سے آگاہ کیا اور بتایا کہ سکندر میرزا کی آئندہ چال کیا ہے - چنانچہ اس کا ذکر انہوں نے اور دوستوں کے علاوہ مجھ سے بھی کیا - میں نے کہا کہ میرزا کی یہ فطرت ہے کہ وہ ہر لحظہ توڑ پھوڑ میں لگا رہتا ہے - جب تک الیکشن نہیں ہوتا اس کو راضی رکھیں - چنانچہ وہ سفر منقطع کر کے کراچی چلے گئے - وہاں پہنچ کر مجھے فون کیا فوراً پہنچو - میں اسی وقت طیارہ سے چلا گیا - معلوم ہوا کہ سکندر میرزا نے نیا گل کھلایا ہے وہ انہیں تو نہیں لیکن ان کی وساطت سے گرمانی صاحب کو فی الفور سبکدوش کرنا چاہتا ہے -

میں نے عرض کیا ، آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے ؟

کہنے لگے میرا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے ؟ میجارٹی ان کی ہے - وہ سب یہی چاہتے ہیں -

میں نے کہا سب کون ؟

فرمایا ریپبلکین والے -

میں نے کہا ریپبلکین سے مراد قومی اسمبلی میں ان کے ممبر ہیں ؟

کہنے لگے ، ہاں -

میں نے کہا ان میں ایک گروپ ایسا بھی ہے جو گرمانی صاحب کا مرہون منت اور سیاسی طور پر انہی کا پروردہ ہے -

فرمایا وہ کون لوگ ہیں ؟

میں نے کہا عبدالحمید دستی اور عابد حسین وغیرہ -

کہنے لگے - ان لوگوں نے سکندر میرزا کو دستخط کر کے دیئے ہیں کہ انہیں گرمانی صاحب کی ضرورت نہیں -

میں نے کہا ذہن تسلیم نہیں کرتا - دستی تو سر تا پا گرمانی صاحب کی تصنیف ہیں -

کہنے لگے - میں نے ان آنکھوں سے دستخط دیکھے ہیں - میرزا کہتے ہیں تم نے گرمانی صاحب سے استعفیٰ نہ لیا تو پھر مجھے اُسے برخاست کرنا پڑے گا - اس صورت میں ریپبلکین پارٹی آپ کی امداد سے بھی دستبردار ہو جائے گی -

میں نے کہا آپ اس کے داؤں میں نہ آئیں - ہو سکتا ہے اس کا نتیجہ مزید خرابی کا باعث ہو ؟

کہنے لگے - داؤں نہیں - میرزا حلفاً یقین دلاتا ہے کہ گرمانی صاحب کو الگ کرنے کے بعد بعض معلوم اندیشے خود بخود ختم ہو جائیں گے -

میں نے کہا - مجھے تو ان اندیشوں کا علم نہیں - آپ کے علم میں ہوں تو الگ بات ہے - لیکن یہ سب اس کی ذہنی عیاریاں ہیں - وہ گرمانی صاحب کو آپ کے ہاتھوں نکلوا کر پھر لازماً آپ پر ہاتھ ڈالے گا - اور آپ اس کے بعد زیادہ دیر تک نہیں رہ سکیں گے -

سہروردی صاحب نے پوچھا -

" کیوں " ؟

صرف اس لئے کہ اس کی فطرت یہی ہے ۔ گرمانی صاحب اس کے محسن ہیں ۔ جن دنوں صرف سکریٹری تھا وہ گرمانی صاحب کے مکان کا روزانہ طواف کرتا تھا ۔ آج اگر ان سے دغا کر سکتا ہے تو کل کلاں آپ سے بھی یہی کرے گا پھر جن لوگوں نے گرمانی صاحب کی سیاسی مورتی ہونے کے باوجود ان کے خلاف دستخط کر دیئے ہیں وہ آپ سے کب وفا کر سکتے ہیں ؟

" تو پھر کیا ہونا چاہئے "

آپ گرمانی صاحب کو بلوا کر مشورہ کریں اور ان سے معلوم کریں کہ اس کشمکش میں نیشنل اسمبلی کے کتنے لوگ ان کا ساتھ دے سکتے ہیں ؟ آخر سید امجد علی وغیرہ بھی تو گرمانی صاحب کے دوست ہیں ۔ پالیٹکس میں دوستی نہیں چلتی ۔

" لیکن دشمنوں کو طاقتور بھی تو نہیں کیا جاتا ۔

" ٹھیک ہے مگر اس وقت صورتحال اس سے مختلف نہیں کہ گرمانی صاحب سے استعفیٰ لے لیا جائے "

آپ غلطی نہ کریں ؟ اس کے نتائج خراب ہوں گے ۔ میں کہہ چکا ہوں کہ مرزا کا آئندہ وار آپ پر ہوگا ۔

" وہ کیسے ؟ "

بہت سی باتیں صرف محسوس کی جا سکتی ہیں ۔ آثار و قرائن اور نظائر و شواھد اس کا جواز ہوتے ہیں ۔

آخر سکندر میرزا گرمانی سے بگڑا کیوں ہے ؟

" وہ کہتا ہے کہ میرے خلاف ہر روز گورنر ہاؤس میں سازش ہوتی ہے "

" یہ بھی اس کا مفروضہ ہے۔ اس کے خلاف کیا سازش ہوگی ؟

" اس کی اطلاع کے مطابق گرمانی صاحب خود صدر بننا چاہتے ہیں "

" ذہن تسلیم نہیں کرتا۔ اور اگر یہ صحیح ہے تو اس میں عیب کیا ہے ؟ ملک ایک جاہل اور شاطر سے چھٹکارا پا کر ایک مدبر اور شریف آدمی کے ہاتھ میں آ جائے گا۔

کچھ دیر سوچتے رہے۔ کہنے لگے ۔۔۔۔۔ تمہاری قطعی رائے کیا ہے ؟

" میری قطعی رائے تو آپ کے سامنے ہے۔ آپ گرمانی صاحب کے دوست ہیں۔ آپ کو وزیر اعظم بنوانے میں ان کا بھی ہاتھ ہے۔ انہیں کمزور نہ کریں۔ ان سے بات چیت کریں "

مصیبت یہ ہے میرزا نے بنگالی ممبروں کو بھی اپنی سان پر چڑھا لیا ہے۔

" سان پر چڑھانا مشکل نہیں جب کہ سان ہی اقتدار کی ہو آپ یہ کریں کہ نیشنل اسمبلی میں اپنی طاقت کا اندازہ کریں۔ عوامی لیگ کے تیرہ ارکان کے علاوہ اور کتنے ممبر اس مسئلہ میں آپ کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ یا گرمانی صاحب سے پوچھیں کہ وہ کتنے ممبر دے سکتے ہیں۔

سہروردی صاحب نے کاغذ قلم اٹھا کر حساب شروع کیا تو تھوڑا ہی

فرق نکلا -

میں نے کہا - سردار نشتر سے بھی بات کر لیتے ہیں کہ سکندر میرزا کو انٹا غفیل کرنے میں ان کی پارٹی آپ کا ساتھ دے -

کہنے لگے یہ کیوں کر ہو سکتا ہے !
میں نے کہا ہو سکتا ہے !

فرمایا کون کرے گا -

عرض کیا - - - - - میں ؟

کہنے لگے - اچھا تم نشتر کے پاس جاؤ اور بات کرو - میں سکندر میرزا کے ہاں سے ہو کے آتا ہوں - اس نے مجھے آج رات کھانے پر بلا رکھا ہے -

میں سیدھا نشتر کے ہاں پہنچا - وہ اس وقت کھانا کھا رہے تھے - فوراً ہی بلوا لیا - عرض کیا - میں آپ سے پرائیویٹ بات کرنے آیا ہوں کہا - کھانا کھا لو - ابھی بات کرتے ہیں - میں نے تخلیہ میں سارا قصہ بیان کیا - کہنے لگے - سکندر میرزا کو سبکدوش کرنے کے سوال پر ہم سہروردی کے ساتھ ہیں - لیکن مجھے اندیشہ ہے کہ سہروردی ہی تیار نہیں ہوں گے - گرمانی صاحب کو الگ ہونا پڑے گا - سکندر میرزا گرمانی صاحب سے خوف زدہ ہے - اُس کو اندیشہ ہے کہ وہ کسی وقت اُسے پٹخنی نہ دیں - تم میری طرف سے سہروردی کو پیغام دو کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی اس مسئلہ میں بشرطیکہ وہ تیار ہوں تو ان کا مکمل ساتھ دینے کو

تیار ہو گی ۔ اس کا واضح جواب لے آؤ ۔ پھر سب کچھ طے ہو جائے گا کوئی دقت نہ ہو گی ۔

میں ہاتھ ملا کر جانے لگا تو سردار صاحب نے مصافحہ میں قوت پیدا کرتے ہوئے کہا سہروردی صاحب خود شہ مات کھا جائیں گے ۔ وہ تیار نہ ہوں گے کیوں کہ سکندر میرزا بڑا کائیاں ہے ۔ ایک نٹ کھٹ آدمی ہے ۔ تمام عمر اس کی انہی شرارتوں میں گذری ہے ۔ ہم سرحد کے لوگ اس کو بخوبی سمجھتے ہیں ۔

انہوں نے کھڑے کھڑے خواجہ ناظم الدین کی وزارت سے لے کر آج تک کے حالات کا اُتار چڑھاؤ بیان کیا ۔ جو بلا شبہ طلسم ہوشربا تھے ۔

میں واپس آیا تو گیارہ بج چکے تھے ۔ سہروردی صاحب اپنے کمرے میں دوستوں کو اکٹھا کئے اپنے دورے کی فلمیں دکھا رہے تھے ۔ کہا بیٹھ جاؤ اور فلم دیکھو ۔ رات ڈیڑھ بجے تک فلم چلتی رہی مجھے انتظار ہی رہا کہ جس مقصد کے لئے مجھے بھیجا تھا اس کے متعلق کب دریافت کرتے ہیں ؟ میں نے ایک آدھ دفعہ بات کرنی چاہی تو طرح دے گئے ۔ مجھے حیرت ہوئی ۔ آخر فلم کے بعد میں نے گفتگو بیان کی اور نشتر صاحب کے وعدہ کا ذکر کیا کہ مسلم لیگ اسمبلی پارٹی مکمل تعاون کریگی کہنے لگے۔ بھئی سکندر میرزا سے بات مکمل ہو گئی ہے ۔ اب معاملہ ختم کر دینا چاہیئے ۔

کیسے ؟

" گرمانی صاحب کو بلوایا ہے ان سے استعفیٰ ہی لینا پڑے گا۔
میں نے کہا بابا آپ سخت غلطی کر رہے ہیں۔ سکندر میرزا حکومت میں آپ کے آخری دوست کو آپ کے ہاتھوں پٹوا رہا ہے۔

کہنے لگے، معاملات کی نوعیت ایسی ہو گئی ہے کہ گرمانی صاحب کا چلے جانا ہی حکومت کے لئے مفید ہے۔

" لیکن آپ کے لئے نہیں "

" جو خدا کو منظور ہے "

" خدا کو یہی منظور ہے کہ آپ جو اقدام کر رہے ہیں اس پر نظر ثانی کریں۔ ورنہ یاد رکھیں ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر سکندر میرزا آپ کو بھی سبکدوش کر دے گا۔ اس کے بعد آپ کمزور ہونگے طاقتور نہیں "

سہروردی صاحب چونکہ فیصلہ کر آئے تھے اس لئے گفتگو کے موڈ میں نہ تھے۔ کہنے لے۔ ناہید (سکندر میرزا کی بیوی) پاس بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر میرزا نے کہا ہے کہ مجھے اپنی اس محبوب متاع کی قسم! گرمانی صاحب کو آپ الگ کرائیں میری اور آپ کی دوستی پختہ رہے گی۔ میں آپ کا ساتھ دوں گا۔ اگر دغا کروں تو ناہید مر جائے!

میں نے کہا۔ بابا تو پھر وہ ناہید سے بھی اُکتا گیا ہے۔ اُس کی موت چاہتا ہے۔

بابا بہت ہنسے۔ لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میں اگلے دن

صبح سویرے نشتر صاحب کے ہاں پہنچا - انہیں خبر ہو چکی تھی - مجھ سے کہنے لگے -

"کیا خبر لائے ہو" ؟ میں نے سارا قصہ بیان کیا - مسکرائے - کہنے لگے میں تم سے کہتا تھا کہ یہی ہو گا - سہروردی چالاک نہیں - وہ اس بد بخت کے چکر میں آ گئے ہیں - پھر دیر تک میرزا کی عیاریوں اور سیہ کاریوں کا ذکر کرتے رہے -

میں گرمانی صاحب کے پہنچنے سے پہلے ہی لاہور آ گیا - لیکن آتی دفعہ بابا سے کہہ آیا کہ آپ نے شدید غلطی کی ہے - میرزا نے آپ کے بازو کاٹ دئے ہیں - اب اس کا آئندہ حملہ آپ پر ہو گا - یہی ہوا مہینہ ڈیڑھ مہینہ بعد خبر آ گئی کہ سہروردی نے استعفیٰ دے دیا ہے - مطلب تھا کہ ان سے استعفیٰ طلب کر لیا گیا ہے -

اسی رات موچی دروازہ کے باہر عوامی لیگ کے زیر اہتمام جلسۂ عام ہوا عوامی لیگ کے مقرر سکندر میرزا پر ہلکی پھلکی نکتہ چینی کر رہے تھے - حمید نظامی مجھے گھر سے اٹھا کر جلسہ گاہ میں لے گئے - دیکھیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے - ابھی ہم پہنچے ہی تھے کہ لوگوں نے دیکھتے ہی شورش ، شورش کا غل مچا دیا - میں ابھی تک عوامی لیگ میں دوبارہ شامل نہیں ہوا تھا لیکن نظامی صاحب کی خواہش اور لوگوں کے زبردست اصرار پر تقریر جھاڑ دی -

سکندر میرزا کا خوف پورے ملک پر بیٹھا ہوا تھا - ہر شخص

اس سے ڈرتا تھا - کسی میں حوصلہ نہیں تھا کہ اس پر کھلم کھلا تنقید کرے - یا جو کچھ وہ ہے کھول کر رکھ دے - میں نے پبلک کو اس کی بد عنوانیوں سے آگاہ کرتے ہوئے سخت تنقید کی اور مطالبہ کیا کہ میرزا کی (Impeachment) ہونی چاہئے - لوگوں نے ہاتھ اٹھا کر قومی اسمبلی میں اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی تائید کی - چاروں طرف ایک جوش پیدا ہو گیا کہ کسی شخص نے تو اس باولے کے گریبان میں ہاتھ ڈالا ہے ؟ میں نے لوگوں کے حوصلے کو اور بالا کرنے کے لئے کہا کہ اس وقت رات کے بارہ بجے ہیں ابھی جلوس نکالا جائے جو اسمبلی ہال پر جا کر ختم ہو اور اس میں سکندر میرزا پر مقدمہ چلائے جانے کے مطالبہ کا اعادہ کیا جائے - زبردست جلوس نکلا - افسروں کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں - وہ بھاگم بھاگ صوبائی اسمبلی تک پہنچے - سارا لاہور '' سکندر میرزا مردہ باد '' '' سکندر میرزا کے خلاف مقدمہ چلاؤ '' - '' سکندر میرزا انگریزوں کا جاسوس ہے '' کے فلک شگاف نعروں سے گونج اٹھا - غرض اس طرح ملک کا ایک بت جس نے لوگوں کے دلوں اور دماغوں کو خوف زدہ کر رکھا تھا اور ہمیشہ مارشل لاء لگا کر لوگوں کو پٹوا دینے کی دھمکی دیتا تھا - لاہور کے کوچہ و بازار میں واشگاف گالی ہو گیا خبر جنگل کی آگ بن کر پھیل گئی - حتیٰ کہ بی - بی - سی نے بھی اس کو نشر کیا کہ لاہور کے شہریوں نے سکندر میرزا کی (Impeachment) کا مطالبہ کیا اور اس کے خلاف آدھی رات کو زبردست جلوس نکالا ہے -

صبح سویرے بابا کا فون آ گیا ۔ کراچی پہنچو ۔ میں ہوائی جہاز سے سیدھا کراچی پہنچا ۔ ابھی تک وہ سرکاری مکان ہی میں (Care taker) وزیر اعظم تھے ۔ معلوم ہوا کہ مسلم لیگ کے زعماء جنھوں نے سکندر میرزا کے خلاف سب و شتم کا طوفان اٹھا رکھا تھا اور آئے دن حکومت کا تختہ اُلٹ دینے کی سوچا کرتے تھے۔ سکندر میرزا کے ہتھے چڑھ کر وزارت کے لئے پخت و پز کر رہے ہیں ۔ چنانچہ چندریگر ہر چیز کو طاق پر رکھ کر اپنی حقیر اقلیت کے ساتھ وزیر اعظم ہو گئے ۔ میاں ممتاز دولتانہ وزیر دفاع ہوئے ۔ لیکن بچہ سقہ کی بادشاہی میں کب تک رہتے انہیں بھی مہینہ بھر ہی میں سبکدوش ہونا پڑا ۔ سکندر میرزا نے ان کے ہاتھ سے "مرر" جیسے مجلسی ماہنامہ کو صرف اس لئے بند کروا دیا کہ اس میں مرزا کی ذات پر تنقید کی گئی تھی ۔ جب میں نے اور نظامی صاحب نے اس سلسلہ میں چندریگر سے ملاقات کی تو کہنے لگے کہ صدر کا بہر حال ہر ملک میں احترام کیا جاتا ہے ۔ "مرر" نے جو کچھ لکھا اس کا ٹیسٹ اچھا نہیں تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے کہا ابھی کل تک مسلم لیگ کے زعماء اس سے زیادہ برے ٹیسٹ کا مظاہرہ کرتے رہے ہیں ۔ آج آپ لوگوں کے حکومت میں آنے سے وہ معیار بدل گیا ہے ۔ میری طرف ذرا تنقیدی نگاہ سے دیکھا میں نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا ۔

"آپ کی وزارت عظمیٰ میں یہ نہیں ہونا چاہیئے ۔ لیگ پر دھبہ لگ جائے گا ۔ اور میں بہ ادب آپ سے کہنا چاہتا ہوں

کہ میرزا عنقریب آپ لوگوں کو بھی پٹخنی دے گا۔ اس نے اپنے موجودہ اقدام سے یہ ثابت کیا ہے کہ لیگ والے بھی وزارت ہی کے لئے اُس سے نبرد آزما تھے"

چندریگر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔ بات تو انہوں نے سن لی۔ لیکن انہیں ناگوار محسوس ہوئی۔ نتیجہ وہی نکلا جو میں عرض کر آیا تھا۔ مسلم لیگ بھی دو دن بہار دکھا کر غفرلہ' ہو گئی۔ ملک فیروز خاں نون ملک کے وزیر اعظم ہو گئے ----

میرزا کو مقدمہ (Impeachment) چلانے کے مطالبہ نے بڑا بدحواس کیا۔ اس نے محسوس کیا کہ اس کا خوف ماند پڑ گیا ہے۔ جس ہیبت کو اس نے دلوں پر بٹھا رکھا تھا وہ نقش بر آب ثابت ہوئی ہے۔ بابا ابھی وزیر اعظم ہاؤس ہی میں تھے سکندر میرزا نے کہلوا بھیجھا کہ (Impeachment) کے مطالبہ نے آئندہ کے امکانات پر پانی پھیر دیا ہے۔ یہ بھی اس کی ایک چال تھی اور وہ سہروردی کو مغربی پاکستان میں بالکل تنہا کر دینا چاہتا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ حمید نظامی اور شورش کاشمیری سہروردی کے ساتھ ہیں۔ وزیر اعظم سہروردی کے اکثر ساتھی اس نے اپنے جاسوس بنا لئے تھے لیکن نواب زادہ نصر اللہ خان اور آفتاب احمد بہر حال ان کے ساتھ تھے۔ انہیں سہروردی سے بلا کا عشق تھا۔ آفتاب سی ایس پی اور ان کے سکریٹری تھے۔ بابا ہی کے لئے انہیں ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑا اور وہ قربان ہو گئے۔ سکندر میرزا چاہتے تھے کہ ان کے خلاف (Impeachment) کا اعادہ نہ ہو۔ انہوں

نے سہروردی کو یہی کہلوا بھیجا تھا لیکن سہروردی طرح دے گئے - میں نے جو کچھ کہا اپنے صوابدید پر کہا - کیوں کہ ملک کے مفاد کی خاطر اس کے خوف اور دبدبے کو توڑنا میں نے اپنا موقف بنا لیا تھا - چنانچہ کراچی کے جلسہ عام میں وہاں کے ایک مشہور سیاسی بدمعاش کی ہڑ بونگ اور کمک کے باوجود تقریر ہو کے رہی - سہروردی صاحب کی صدارت میں بھی (Impeachment) کا مطالبہ کیا گیا - سکندر میرزا کو سخت پریشانی ہوئی - میں نے اعلان کیا کہ ملک بھر میں اس مطالبہ کا اعادہ کیا جائے گا - سکندر میرزا نے بھی اپنے حواریوں کو شہ دی کہ وہ جلسوں کو خراب کریں - لیکن میں نے کراچی سے لے کر لاہور تک اور لاہور سے لے کر پشاور تک بے شمار جلسوں میں سکندر میرزا کو آڑے ہاتھوں لیا - ہر جگہ یہی مطالبہ دہرایا کہ اس پر مقدمہ چلایا جائے - میرزا نے جب دیکھا کہ مطالبہ عام ہو گیا ہے تو اس نے تاش کے دوسرے پتے استعمال کرنے شروع کئے - اپنے ایک شیعہ معتمد کو جو میرا بھی دوست تھا بلا کر کہا کہ شورش سے میری ملاقات کا انتظام کرو اس نے کہا وہ ان حالات میں نہیں ملے گا - مرکزیہ مجلس اقبال کے صدر خواجہ عبدالرحیم سے کہا کہ وہ اس کا سپیشل طیارہ لے جائیں اور شورش کو ساتھ لائیں - اس سے کہیں میرے ساتھ دوستی کا ہاتھ بڑھا کر دیکھے میں دوست ثابت ہوں گا خواجہ صاحب راوی ہیں کہ میں نے حتمی وعدہ کرنے سے پس و پیش کیا - اور عذر تراشا کہ حمید نظامی کے بغیر شورش آپ سے نہیں ملے گا - حمید نظامی کو

بھی بلوائیے - میرزا نے کہا کہ حمید نظامی کے ساتھ میں مفاہمت نہیں کرنا چاہتا - مجھے صرف شورش کی ضرورت ہے -

خواجہ صاحب کیا یقین دلا سکتے تھے میرزا سے کہا کہ شورش اپنے ہی ڈھب کا آدمی ہے - اس کو رام کرنا مشکل ہے - وہ اتنا آگے جا چکا ہے کہ لوٹنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا - خواجہ صاحب نے یہ واقعہ مجھ سے بیان کیا تو میں نے کہا آپ نے صحیح جواب دیا - میرزا کو پورے ملک کو بے آبرو کرنے کی ضرور سزا ملنی چاہئے آخرکار وہی ہوا - میں نے ایک دفعہ میرزا کو ٹوکتے ہوئے کہا تھا کہ جس مارشل لاء کی دھمکی دے رہے ہو وہ سب سے پہلے تمھیں کھا جائیگا - چنانچہ مارشل‌لاء لگا تو اس کا پہلا صحیح اور جائز شکار اسکندر میرزا تھا - جسے اپنی ملکہ ناہید کے ساتھ ملک بدر ہونا پڑا اور آج کل لندن میں جلا وطنی کی زندگی بسر کر رہا ہے - اگر وہ ملک میں رہ جاتا اور اس کی صدارت قائم رہتی تو اس کا لازمی نتیجہ ایک خوفناک قسم کی تباہی تھا - پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ اس نے ملک کو بازیچۂ اطفال بنا رکھا تھا اور پریذیڈنٹ ہاؤس مختلف قسم کے کھلنڈروں کی آماج گاہ تھا - جہاں صبح و شام سازشوں کے علاوہ جوأ ہوتا یا شراب کے خم لنڈھائے جاتے تھے -

میرے نزدیک صدر ایوب کا سب سے بڑا اور مستحسن کارنامہ یہ تھا کہ انہوں نے سکندر میرزا کو سبکدوش کر کے ملک سے نکال دیا - صدر کے اس اقدام کو خود مس فاطمہ جناح نے بھی اس زمانہ میں

سراہا تھا ۔

خواجہ ناظم الدین کی وزارت عظمیٰ کے زمانہ ہی میں سہروردی نے کہا تھا کہ سکندر میرزا اپنی شاطرانہ چالوں سے ایک دن ملک کا صدر ہو جائے گا۔ جن دنوں وزارت میں تھے تو ان کا یہ قطعی خیال تھا کہ ملک میں مارشل لاء لگا کر موجودہ نظام کی صورت ہی بدل دی جائے گی ۔ البتہ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ سکندر میرزا ایک روز اس طرح خائب و خاسر ہو کر نکلے گا کہ پریذیڈنٹ ہاؤس ہی میں تین جرنیل اس سے دستبرداری کے کاغذ پر دستخط لیں گے ۔ وہ صدر ایوب سے ٹیلی فون پر بات کرنا چاہے گا ۔ لیکن اس کو اجازت نہ دی جائے گی ۔ مہلت صرف اتنی ہو گی کہ اپنے کپڑے لے سکے پھر اس کو دو چار روز کوئٹہ میں نظر بند رکھا جائے گا وہاں اس کو بی او اے سی کے طیارے میں کسی مسافر کی سیٹ دے کر راتوں رات جلا وطن کر دیا جائے گا اور اس کے ساتھ حسرتوں کے علاوہ صرف ناہید ہو گی ۔ جس پر اس نے اپنے زمانۂ اقتدار میں غاصبانہ قبضہ کیا تھا ۔

صدر ایوب نے میرزا کی جلا وطنی کے بعد مختلف قسم کے اقدامات شروع کر دئے افسروں کی سکریننگ کے علاوہ سیاستدانوں پر ایبڈو کا نفاذ بھی ان میں شامل تھا ۔ جس سیاستدان کو چھ سال کے لئے دستبرداری کا نوٹس ملا اس نے سر تسلیم جھکا دیا ۔ لیکن

گرمانی صاحب کے علاوہ صرف سہروردی ایک ایسے سیاستدان تھے جنہوں نے اپنے خلاف دائر کردہ الزامات کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حکومت کو اپنی فصاحت و بلاغت اور ذہانت و قابلیت سے زچ کیا۔ اس سلسلہ میں ان کا بیان تاریخی اہمیت رکھتا ہے۔ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی اشاعت کب ہو اور ان کا سوانح نگار ان تفصیلات پر کب قلم اٹھائے؟

ان میں نچلا بیٹھنے کا مادہ ہی نہیں تھا۔ وہ ایبڈو کی مار کھا کر بھی سیاست کی شطرنج کھیلنے میں لگے رہے۔ ان کی مجلسوں میں شریک ہونے والوں کی فراخی کا یہ حال تھا کہ ہر قسم کے لوگ آتے اور سبھی قسم کی باتیں سمیٹ کر لے جاتے تھے۔ یہ باتیں پولیس کے کارندوں کی معرفت حکومت کے کانوں تک بھی پہنچتی تھیں۔ سہروردی معمولی انسان نہیں تھے کہ ان سے حکومت غافل رہتی۔ بہت سی باتیں جمع ہو گئیں اور ان کا سیاسی خطرہ حکومت کے نزدیک تشویشناک ہو گیا تو جنرل اعظم کو جو اس زمانے میں مشرقی پاکستان کے گورنر تھے ہدایت ہوئی کہ سہروردی کو مشرقی پاکستان میں گرفتار کر لیں۔ انہوں نے اتفاق نہ کیا۔ تب انہیں کراچی میں گرفتار کر کے مقامی جیل خانہ میں ڈال دیا گیا۔ جہاں نو ماہ تک پڑے رہے۔ اور حکومت کی مختلف کوششوں کے باوجود ہر قسم کے وعدے سے احتراز کیا۔ بلکہ شیروں کی طرح کچھار میں چنگھاڑتے رہے۔ غالباً انہیں اوصاف پر انہیں شیر بنگال کہا جاتا تھا ان کے متعلق مولانا ظفر علی خاں کا مشہور شعر ہے۔

شہید سہروردی کو بنا کر ساربان اپنا
روانہ ہو رہا ہے سوئے منزل کارواں اپنا

حکومت ان سے سمجھوتہ کرنا چاہتی تھی - لیکن کوئی شخص ایسا نہیں تھا جو راستہ ہموار کر سکتا ہو - ایک دفعہ صوبائی سطح پر مجھ سے کہا گیا کہ میں ان سے بات چیت کروں یہ اس زمانہ کا ذکر ہے جب آئین آ رہا تھا اور حکومت نے دماغ کے بند دریچوں کو تھوڑی سی ہوا کے لئے کھول دیا تھا - میں نے عذر کیا کہ میں اس کا اہل نہیں یہ حکومت کے مسؤلین اور ان کے مابین ہی گفتگو ہو سکتی ہے - بہر حال ایک دن وہ رہا کر دئے گئے - سارے ملک میں خوشی کی لہر دوڑ گئی - ہم لوگ بھی مبارکباد دینے کراچی پہنچے - کہنے لگے -

آ گئے شورش ! ہم بھی آپ کی سنت پر عمل کر آئے ہیں میں نے کہا - " سنت یوسفی کہیئے " -

حکومت انہیں رہا کر کے چوکنا ہو گئی کیونکہ اسے معلوم تھا کہ سہروردی سب کچھ چھوڑ سکتے ہیں لیکن سیاسیات سے کنارہ کش نہیں ہو سکتے - چنانچہ ان کے جلسوں کو تاراج کرنے کا فیصلہ کیا گیا -

کراچی کا جلسہ مقامی بدمعاشوں اور ان کے ایک نامور سرغنہ نے خراب کیا - لاہور کا جلسہ بھی اسی طرح برباد ہوا - رات بھر ایک ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس کی صدرات میں جو بعد میں سپرنٹنڈنٹ پولیس

ہو گیا اس جلسہ میں گڑ بڑ ڈالنے کا نقشہ بنتا رہا ۔ گوجرانوالہ میں یہی حادثہ پیش آیا ۔ بلکہ وہاں تو انہیں گولی مار دینے کا حوصلہ کیا گیا ۔ ایک ذمہ دار پولیس آفیسر کی روایت سے انہوں نے جلسہ عام میں اس کا ذکر کیا ۔ خواجہ صدیق الحسن جو مقامی عوامی لیگ کے نوجوان راہنما تھے سہروردی ان کے ہاں فروکش تھے ۔ شہر کے اوباشوں کا ایک جلوس مقامی ایس ایچ او کی قیادت میں ایس ایچ او زندہ باد اور شہید سہروردی مردہ باد کے نعرے لگاتا ہوا ان کی کوٹھی پر پہنچا ۔ دیر تک غل ہوتا رہا ۔ راولپنڈی اور سیالکوٹ میں بھی یہی معاملہ پیش آیا ۔ غرض سہروردی پنجاب میں جہاں گئے بد معاشوں کو ان کے خلاف انگیزا گیا ۔ نتیجتہً سہروردی دل برداشتہ ہو کر واپس کراچی چلے گئے اور یہ بات ان کے دل پر نقش ہو گئی کہ مغربی پاکستان کا سارا علاقہ سیاسی طور پر ریگستان ہے ۔ پنجاب میں خون حسین کی بھی قدر نہیں ہو سکتی اور وہ تو حسین شہید ہیں ۔ ان کا خیال تھا کہ ذمہ دار لوگ انہیں قتل کروانا چاہتے ہیں ۔ اس چیز نے ان کے دل پر سخت اثر کیا وہ گویا محسوس کرتے تھے کہ اب تک وہ کلیساؤں میں اذان دیتے رہے ہیں یا بتکدوں میں مورتیوں سے مرادیں مانگنے کی غلطی کا شکار ہوئے ہیں ۔ جب وہ موت کے سفر پر انگلستان جا رہے تھے تو مجھے تار دے کر بلوایا کہ دو روز کے لئے کراچی آ جاؤ ۔ کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں ۔ میں حاضر ہو گیا ۔ وہ سونے کے کمرے میں پاجامہ اور بنیان پہنے ادھر اُدھر بکھرے ہوئے

کاغذوں کے انبار میں گھرے بیٹھے تھے ۔ ان کی عادت تھی کہ سونے کے کمرے میں دو پلنگ رکھتے ۔ ایک آرام کے لئے دوسرا کاغذوں اور کتابوں کے لئے ۔ سب کچھ بستر ہی پر لکھتے حتیٰ کہ مقدمات کی تیاری بھی بستر ہی پر کرتے یا کراتے ۔ آخری عمر میں ان کی خواب گاہ ہی ان کا دفتر ان کا ڈرائینگ روم اوران کا سیاست خانہ تھا ۔ جب کام کرتے کراتے تھک جاتے تو سر پہ کسم کے تیل کی مالش کراتے یا کچھ دیر جھولے میں لیٹ کر ہلکورے لیتے جس سے خاص قسم کی راحت محسوس کرتے تھے ۔

کہنے لگے میں نے تمھیں کچھ باتیں کرنے کے لئے بلایا ہے ۔
" ارشاد "

س ۔ ارشاد کیا؟ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مغربی پاکستان میں کچھ نہیں ہو سکتا یہ سر زمین انسانی شعور اور سیاسی فکر کے اعتبار سے بنجر ہے ۔

ش ۔ ''آپ مایوس ہو گئے ہیں ۔

س ۔ مایوس ہی کہہ لو لیکن میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں ۔

ش ۔ یہ ملک کی بد قسمتی ہے ۔

س ۔ کچھ ہی کہہ لو ۔ لیکن اسباب و وجوہ سے قطع نظر یہاں پر امن انقلاب یا لوگوں کی حسب منشا دستوری تبدیلیوں اور سیاسی جد و جہد کے لئے آب و ہوا مفقود ہے ۔

ش - جب آپ جیسا جہاندیدہ سیاستدان اس نتیجہ پر پہنچ چکا ہے تو ہم جیسے لوگ جن کی سیاسی حیثیت ہی بے نام ہے ان کی حالت کیا ہو گی -

س - تجربہ انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے - انسانی فطرت ہے کہ وہ دوسروں کے تجربوں سے فائدہ نہیں اُٹھاتی بلکہ خود تجربہ کرنا چاہتی ہے - مسلمانوں کے تاریخی مزاج پر تم جو کچھ کہا کرتے تھے میں آج اس کی تائید کرتا ہوں -

ش - مسلمانوں کی عام تاریخ یہی ہے -

س - تم ٹھیک کہتے ہو - شروع سے یہی ہو رہا ہے -

ش - سید عطااللہ شاہ بخاری فرماتے تھے مسلمانوں کا تاریخی شیوہ ہے کہ وہ طاقت کے آگے آگے اور دولت کے پیچھے پیچھے چلتے ہیں - یہ سن کر پھڑک اٹھے - کہنے لگے کتنی بڑی بات چند لفظوں میں کہہ ڈالی ہے - افسوس ان سے ملاقات نہ ہو سکی - حسرت ہی رہی - سنا ہے ان کی تقریر بہتے ہوئے دریا اور اُڑتی ہوئی ہوا کو روک لیتی تھی اور در و دیوار گوش بر آواز ہو جاتے تھے -

ش - جی ہاں ان کی تقریر میں جادو تھا - لیکن آن کا خیال تھا - کہ "یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا" کہنے لگے دوسرا مصرع کیا ہے - میں نے کہا شاد عظیم آبادی

کا شعر ہے۔ دوسرا مصرع ہمارے حسب حال ہے۔

س ۔ تو کیا ہے۔

ش ۔ یہاں نہ نشو و نما کا حاصل نہ کوئی ثمرہ ہے رنگ و بو کا
ہنسو گے خود اس چمن پہ غنچو زمانہ آلے ذرہ نمو کا
اس وقت اس شعر کا تاثر ہی کچھ ایسا تھا کہ لوٹ پوٹ ہو گئے۔ چندے ان کہے خیالوں میں مستغرق رہے پھر فرمایا۔

س ۔ جتنا کام میں نے مغربی پاکستان بالخصوص پنجاب میں کیا ہے مشرقی پاکستان میں کیا ہوتا تو نقشہ ہی مختلف ہوتا۔ ایک طرف یہاں لوگوں کے جوش کا یہ حال ہے کہ بچھے جاتے ہیں۔ لیکن جو نہی آزمائش کا مرحلہ آتا ہے خنجر بھونک دیتے ہیں۔ آدمی سوچتا ہی رہ جاتا ہے۔ میں پنجاب میں کہاں کہاں نہیں گیا کوئی ضلع یا کوئی قصبہ نہیں چھوڑا، دیہات میں صبح و شام ایک کئے ہیں۔ لیکن جو نتیجہ انتخابات کا نکلا وہ بھی کوئی شاندار نہیں تھا۔ ہمارے ٹکٹ پر جو لوگ منتخب ہوئے تھے انہوں نے مسلم لیگ میں شامل ہوتے وقت ضمیر کی خلش بھی محسوس نہ کی۔ بلکہ ڈھٹائی کے ساتھ حکومت کے اُن قوانین کی تائید کرنے لگے جن کے خلاف اپوزیشن نے الیکشن لڑا تھا۔ لوگ جب تک حکومت کا اشارہ نہ ہو زندہ باد کہتے ہیں حکومت کی منشا ہو تو ایک معمولی تھانیدار بھی سارے شہر کو بڑے سے بڑے آدمی کے خلاف

متحد کر سکتا ہے ، میری سمجھ میں نہیں آتا کہ پنجاب کے لوگوں میں یہ کیا ہے؟ حالانکہ اس زمین نے زندگی کے ہر شعبہ میں بڑے بڑے لوگ پیدا کئے ہیں، جو صوبہ اقبال اور ظفرعلی خان پیدا کر سکتا ہے۔ اس صوبہ میں یہ انحطاط بڑا ہی افسوسناک ہے؟

میں نے ان کی بات قطع کرتے ہوئے کہا۔

سید عطا اللہ شاہ بخاری بھی آخری زندگی میں اسی سوچ کے عادی ہو گئے تھے کہا کرتے تھے، میں نے عمر بھر لوگوں کو قرآن سنایا لیکن کسی پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ لوگوں کے ضمیر کو جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر جگایا کسی کی آنکھ نہ کھلی۔ آخر میں ہی تھک ہار کے رہ گیا اب گور کنارے ہوں جو لوگ میرے ساتھ سفر کو نکلے تھے ان میں اکثر مصائب کے پہاڑوں میں دب گئے بعض بچھڑ گئے کئی پچھڑ گئے پروانے فنا ہو گئے۔ میں تنہا رہ گیا۔ اب اس اندھیرے میں جگنوؤں کو لے کر روشنی پھیلا رہا ہوں۔ لیکن یہ میری حماقت ہے۔ کبھی جگنوؤں کی روشنی سے بھی رات ٹلی ہے۔ میں نے ان لوگوں میں وعظ کیا جن کے دلوں میں انجماد آ چکا اور جن کی عقلوں کو طاعون کھا گیا ہے۔ اگر میں یہی کلام پہاڑوں کو سناتا تو وہ چلنے لگتے۔ چٹانوں سے ہم کلام ہوتا تو بولنے لگتیں۔ صحراؤں میں قرأت کرتا تو ان میں سبزہ اُگ آتا۔

بادلوں سے کہتا تو برسنے لگتے - بجلیوں کو پکارتا تو کوندنے لگتیں - دریاؤں سے کہتا تو رک جاتے - ہواؤں سے مخاطب ہوتا تو گوش بر آواز ہو جاتیں - لیکن میں نے ان بستیوں سے خطاب کیا جو زندہ عذاب ہیں - میں نے ان لوگوں کو جگانا چاہا جن کی آنکھیں کھلی ہوئی ہیں لیکن دیکھنے سے انکاری ہیں - - - - - - - - - !

سہروردی آبدیدہ ہو گئے - میں نے زندگی میں پہلی دفعہ ان کی آنکھوں میں آنسو دیکھے - ایک ہنستا بولتا چہرہ اُداس ہو گیا - جیسے ہچکی بندھ گئی ہو یا بنگال کے ایک دلفریب گیت کی تان ٹوٹ رہی ہو - - - - - کہنے لگے پنجاب در اصل فاتحوں کی گذر گاہ رہا ہے - اس لئے اس کا ضمیر و خمیر بھی گذر گاہ ہو گیا ہے - انگریزوں نے سکھوں کے ہاتھ سے پٹے ہوئے اس صوبہ کو اور ویران کیا - جس سے یہ فوجی بھرتی کا اڈہ بن گیا - لیکن سیاسی طور پر قبرستان ہو گیا - یہاں کے لوگ سیاسی زبان ہی نہیں سمجھتے وہ صرف طاقت کی زبان سمجھتے ہیں - سیاسی شعور صرف ان شہری نوجوانوں میں ہے جو سیاست و علم کی جدید تحریکوں سے آشنا ہیں - لیکن انہیں ابھی پختہ ہونے کے لئے ایک عمر یا عرصہ چاہئے - سارے صوبہ پر زمینداروں اور جاگیرداروں کا قبضہ ہے - صنعت کاروں کی جماعت ابھی بن رہی ہے - اس نے شہری زندگی کے سیاسی مزاج کو ہاتھ میں لیا ہے - لیکن

بہ تمام قابو نہیں پا سکے۔ رہ گئی مڈل کلاس ، تو وہ بحران میں ہے۔ اس سے سیاسی کارکن اُٹھیں گے ضرور، لیکن ابھی ان کے آب و گل کی کما حقہ آرائش نہیں ہوئی۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے تو عوام ہی اصل طاقت ہیں۔ مجھے ان پر بھروسہ ہے۔ جمہوری سیاست میں عوام ہی پر بھروسہ کیا جاتا ہے لیکن پنجاب کے عوام ابھی کالانعام ہیں۔ انہیں بڑے بڑے زمیندار اور اب نودولتے کارخانہ دار جانوروں کی طرح ہانکتے اور کرگھوں کی طرح برتتے ہیں۔ میں نے دیہات میں دیکھا ہے کہ زمیندار ان کا خدا ہے۔

میں نے بات کاٹ کر عرض کی۔

''آپ کو یاد ہو گا ملتان کے پاس شیرشاہ میں مخدوم غلام عباس کے ہاں دیہاتی عوام کا حال کیا تھا؟ آپ کے استقبال کی خاطر لوگ قطار باندھے کھڑے تھے۔ لیکن نہ انہیں زندہ باد کہنا آتا تھا نہ اللہ اکبر، ان میں سے ایک الاپتا تھا۔

شہید سہروردی

اور قطاریں پکارتی تھیں۔

ہو ہو ہو

یہ ہو سر تال کی طرح کھنچتی اور پھیلتی تھی۔ میں نے دیوان غلام عباس سے کہا۔ آپ انہیں کلمہ یا تکبیر کیوں نہیں سکھاتے۔ انہوں نے فرمایا۔ کمال کرتے ہیں آپ؟ ہم ان

لوگوں کے منہ میں اپنے نانا کا نام کیسے دے دیں یہ تو کئی کئی مہینے نہاتے نہیں - منہ ہاتھ نہیں دھوتے - گندے لوگ ہیں - ان کی زبانوں کو پاکیزہ نام سکھا کر ہم اللہ و رسول کی اہانت کے مرتکب نہیں ہونا چاہتے -

میں نے سہروردی صاحب کو یاد دلایا کہ ہم لوگ جب چائے پی چکے تو ہمارے منہ سے جو ریزے گرے تھے لوگ چن چن کے کھا رہے تھے اور جب میں نے انہیں ٹوکا تو کہنے لگے سادات کے جھوٹے ٹکڑے کھانے سے قیامت کے دن بخشش ہو گی - ایسی قوم کو بدلنے کے لئے واقعی کسی رجل رشید کی ضرورت ہے -

س - ہاں بھائی !یہاں تو آوے کا آوا ہی بگڑا ہوا ہے - پنجاب کی جہالت اور نا خواندگی کا ایک سبب چھوٹے بڑے پیر بھی ہیں جنہوں نے اپنی گدیوں کو کعبتہ اللہ بنا رکھا ہے اور جو اپنے مریدوں سے پاؤں کے تلوے چٹوا کر شرف و مجد انسانی کی ہتک کرتے ہیں - پنجاب کے لوگوں بالخصوص دیہات میں ایک خود ساختہ اسلام رائج ہے - اس اسلام کے مبلغ مسجدوں کے ملا ہیں - جو زمینداروں کے کمیروں کی زندگی بسر کرتے اور لوگوں کو مذہب کے خود ساختہ ٹوٹکوں سے بہلاتے ہیں - ان لوگوں نے اسلام کے نام سے ناجائز فائدہ اُٹھایا اور اس کی آڑ میں لوگوں کے اذہان میں غلامی راسخ کی ہے یہ لوگ عوام کو معاشی مساوات کا احساس ہی نہیں

ہونے دیتے ۔ ان کے نزدیک دولتمند اللہ کے اجارہ دار اور غریب ان کے غاشیہ بردار ہیں ۔

ش ۔ آپ کمیونزم یا سوشلزم کے قائل ہیں ؟

س ۔ میں اسلامی سوشلزم کا قائل ہوں ۔

ش ۔ کیا اسلامی سوشلزم ایک مہمل اصطلاح نہیں ؟

س ۔ نہیں ۔ بلکہ جدید ذہنوں میں اسلامی فکر استوار کرنے کے لئے ایک جامع اصطلاح ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک تو اسلامی تصور ریاست مجروح نہیں ہوتا دوسرے سوشلزم نے معاشی مساوات کا جو نظریہ جدید تعلیم کی وساطت سے لوگوں کے ذہنوں پر مسلط کیا ہے اس کی دل کشی قائم رہتی ہے ۔ ہم جدید دنیا کو سمجھا سکتے ہیں کہ سوشلزم کا اقتصادی نظریہ اسلامی رنگ و روغن سے انسانوں کی فلاح و آسائش کو اور زیادہ منظم کرتا ہے ۔

ش ۔ کمیونزم کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟

س ۔ روس کا کمیونزم تو اب چین کے سوشلزم کی وجہ سے نیشلزم کی طرف راجع ہو گیا ہے ۔ دوسری عالمگیر جنگ کے دوران قریب قریب یہی صورت حال تھی لیکن اس میں نتائج کے اعتبار سے اختلاف ہو سکتا ہے ۔ اصل چیز یہ ہے کہ کمیونزم ایک ایسا نظام ہے جس میں فکر کو ایک ایسی

یونیفارم پہنا دی جاتی ہے - کہ فطرت اس سے ابا کرتی ہے یہ خصوصیت انسانی ذہن کی بو قلمونی پر جبر اور فطرت انسانی پر استبداد نافذ کرتی ہے - اگر کمیونزم میں واقعی زندگی کے برگ و بار ہیں تو روس نے اپنے ملک کے گرد آہنی دیواریں کیوں چن رکھی ہیں ؟ وہاں دوسرے ملکوں کے افراد کو آنے جانے کی اجازت کیوں نہیں ؟ جب کہ عام جمہوری ملکوں میں ایسی کوئی پابندی نہیں ہے -

ش - جمہوری نظام انسانی نظاموں میں سب سے بہتر نظام ہے - بشرطیکہ انسانی محنت کا استحصال نہ ہو اور انفرادی دولت کی حد مقرر کر کے اس پر پابندی لگا دی جائے -

س - جمہوری نظام واقعی بہترین انسانی نظام ہے - اس نے انسانوں کو یہ حق تو دیا ہے کہ اپنے حکمران خود چنیں - عوام کی حاکمیت ہی جمہوریت کا سنگ بنیاد ہے -

ش - لیکن سرمایہ داری کی مضرتوں اور محنت کی طبقاتی کشمکش سے یہ نظام عہدہ برآ نہیں ہو سکا ہے ؟

س - ٹھیک ہے - یہ کوتاہی موجود ہے لیکن انسانی فکر ارتقا کی طرف جا رہا ہے - ضرور حل نکل آئے گا -

ش - کیا اس کا رد عمل کمیونزم نہیں ؟

س - رد عمل تو ہے - لیکن حل نہیں - کمیونزم روٹی دیتا ہے -

لیکن خیال نہیں ۔ انسان صرف معیشت کا نام نہیں تصور کا نام بھی ہے ۔ ہر انسان کی فطری خواہش ہوتی ہے ۔ کہ جو کچھ وہ دیکھ رہا ہے یا جو کچھ اس پر بیت رہی ہے یا جو کچھ اس کے گرد و پیش موجود ہے اس پر اظہار خیال کرے ۔ کمیونزم انسانی ذہنوں کو سکوں کی طرح ڈھالتا ہے ۔

ش ۔ لیکن مسلمان ملکوں میں تو اس نظام کے نام پر عجیب الخلقت نظام قائم ہو رہے ہیں ۔

س ۔ مسلمان ملکوں کا اللہ حافظ ہے ۔ مسلمانوں نے اٹھارویں صدی سے آگے قدم ہی نہیں بڑھایا ۔ یورپ کے صنعتی انقلاب نے نہ صرف ان ملکوں کو تاراج کیا بلکہ مغلوب کر کے غلام بنا لیا ہے سیاسی غلامی سے رہائی پا کر بھی معاشی اور تہذیبی اعتبار سے یہ ملک یورپی افکار و معاش کے غلام ہیں ۔ رہ گئے بادشاہ جو عرب ملکوں میں حکمران ہیں تو وہ قرون وسطیٰ میں زندگی بسر کر رہے ہیں ۔ انہوں نے ملکی وسائل اور قومی دولت کو اپنے لہو و لعب کا ذریعہ بنا رکھا ہے ۔ جن اسلامی ملکوں میں بادشاہت نہیں آمریت یا جمہوریت ہے وہاں آمریت خود غرض ہے اور جمہوریت اپاہج ۔ مسلمان عوام خاص قسم کے استعماری حالات کا شکار ہیں انہیں درماندگی پسماندگی اور بے چارگی نے گھیر رکھا ہے ۔

ش۔ کیا اسلامی بلاک بننے کی اُمید ہے ؟

س۔ اُمید تو ہر چیز کی ہو سکتی ہے ۔ لیکن ابھی اس میں (اگر ممکن الوقوع ہو تو) بڑی تاخیر ہے ۔

ش۔ اکثر اسلامی ملک جغرافیائی طور پر ایک دوسرے کے ساتھ اس طرح بندھے ہوئے ہیں کہ ان کا ایک عالمی وفاق بن سکتا ہے ۔ ایک نہ سہی دو یا پھر تین ۔

س۔ عرب ممالک کسی حال میں بھی باقیماندہ اسلامی ملکوں کے ساتھ ملنے کو تیار نہیں ۔ انہیں ماضی میں ترکوں کی خلافت ، انگریزی استعمار اور ان کے مضمرات نے ایسا بد ظن کیا ہے کہ باقی دنیائے اسلام سے وفاق کا رشتہ پیدا کرنے کی ان میں خواہش ہی نہیں ہے ۔ اُدھر ترکوں کو بھی عربوں سے سخت بد ظنی ہے ۔ وہ پہلی عالمگیر (۱۹۱۴-۱۹۱۸ء) جنگ میں اپنی شکست و رسوائی کا ذمہ دار عربوں کو ٹھہراتے ہیں ۔

ایران کا رویہ بھی عربوں کے متعلق ایسا ہی ہے ۔ پاکستان ایران اور ترکی نے آپس میں دوستانہ معاہدہ کر رکھا ہے ۔ لیکن ان میں کسی باہمی وفاق کا تصوربالکل نہیں ۔ اور نہ اس کے آثار ہیں ۔

ش۔ لیکن ذہن تو کسی مرحلہ میں اس طرف جا سکتا ہے ؟

س۔ بشرطیکہ عالم اسلام کو یکجا کرنے کی تحریک اُٹھ کھڑی ہو لیکن اس کے لئے پہلے عالمگیر فکری مواد پیدا کرنے کی ضرورت

ہے جو ابھی عنقا ہے ۔ مسلمانوں میں اولاً ایسا کوئی شخص ہونا چاہئے جو یورپ کی علمی قیادت کو چیلنج کر سکے ۔

ش ۔ اس میں کہاں تک صداقت ہے کہ ہمارے سیاستدان حکمرانوں نے کبھی افغانستان یا ایران سے مل کر وفاق بنانے پر غور کیا تھا ؟

س ۔ میں یقین سے نہیں کہہ سکتا - سنا میں نے بھی تھا ۔ مگر حکمرانوں کے حزبی اور شخصی مفادات اتنے فراخدل کیونکر ہو سکتے ہیں ؟

ش ۔ مسلمان اکٹھے ہو جائیں تو اولاً تین بلاک بہ آسانی بن سکتے ہیں ۔ اسکے بعد ایک بلاک پر بھی غور کیا جا سکتا ہے ۔

س ۔ وہ تین بلاک کونسے ہیں ؟

ش ۔ ایک بلاک انڈونیشیا سے مشرقی پاکستان تک کے مسلمانوں کا ہو سکتا ہے

س ۔ اس کا مطلب ہے پاکستان کی بھی تقسیم ہو ۔

ش ۔ میں تقسیم کی نہیں وفاق کی بات کر رہا ہوں ۔ دوسرا وفاق مغربی پاکستان ، افغانستان اور ایران کا بن سکتا ہے ۔ تیسرا عرب ملکوں کا اور اگر افریقہ کی مسلمان ریاستیں ان سے الگ رہنا چاہیں تو وہ چوتھا بلاک بنالیں اس میں زیادہ آسانی ہے

س ۔ ترکی کہاں رہے گا ؟

ش ۔ ترکی خود ایک بلاک ہے۔ ورنہ پاکستان ، ایران اور افغانستان

کے ساتھ اس کا رشتہ جوڑا جا سکتا ہے ۔ افغانستان کو چھوڑ کر اسوقت اس رشتہ کی اساس موجود ہے

س ۔ فی الحال تو یہ ایک خوبصورت تصور ہے ۔

ش ۔ خوبصورت تصورات ہی قومی زندگی کا آئیڈیل ہوا کرتے ہیں ۔ کیا پاکستان پہلے ایک خوبصورت تصور نہیں تھا ؟

س ۔ باتیں تو ٹھیک ہیں لیکن اسلامی رشتہ کے باوجود ان ملکوں کے جداگانہ مفادات ہیں وفاق کی تحریک سے ان مفادات میں ٹکراؤ ہو سکتا ہے اور اسکے مضمرات میں بہت سے خدشات ہیں

ش ۔ خدشات تو ہر تحریک کے ساتھ ہوتے ہیں ۔

س ۔ میں اس سے انکار نہیں کرتا ۔ لیکن تم بہت دور کی سوچ رہے ہو ۔ مصر نے شام سے الحاق کیا ، متحدہ عرب جمہوریت کی بنیاد رکھی ۔ نتیجہ کیا نکلا ؟ کے روز انکی وحدت چلی ؟

ش ۔ ظاہر ہے کہ زیادہ دیر نباہ نہ ہو سکا ، لیکن کسی تحریک کے پسپا ہونے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ محو ہو گئی ہے ۔

س ۔ تاہم واقعات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ؟

ش ۔ میں آپ سے متفق ہوں ، لیکن ہم ایسے تصور پر غور کر رہے ہیں جو خارج از امکان نہیں اور اس کا احساس بھی موجود ہے ۔

س ۔ ویسے تو ہر چیز ممکن ہے لیکن فی الحال عرب ممالک نیشلزم کے چکر میں ہیں ، اور وہ آسانی سے اپنی اپنی قومیتیں ترک

کرنے کو تیار نہیں۔ مصر کے جمال عبدالناصر بھی تو فرعونوں کے نام پر فخر کر رہے ہیں۔

ش۔ آپ نے اسی لئے نہر سویز کے موقف پر انگریزوں کی حمایت کی تھی کی؟

س۔ وہ میری سیاسی غلطی تھی۔

ش۔ لیکن آپ نے اعتراف بھی تو نہیں کیا؟

س۔ صرف اس خیال سے کہ عذر گناہ بد تر از گناہ ہو گا۔ سویز پر مصریوں کا حق تھا۔ اور وہ انہوں نے پا لیا۔

ش۔ آپ کے خیال میں اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا امکان ہے؟

س۔ کس شکل میں؟

ع۔ اسلام کی شکل میں۔

س۔ ہم لوگ مسلمان ہیں۔ اللہ کی توحید اور حضور کی ختم المرسلینی پر عقیدہ رکھے بغیر کوئی مسلمان مسلمان ہی نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ ان دونوں کی نفی کرتا ہے یا دونوں میں سے ایک کی نفی کرتا ہے تو وہ مسلمانوں میں رہنے سہنے یا مسلمان والدین کی اولاد کہلانے سے مسلمان نہیں ہو جاتا۔ مسلمان بننے کے لئے اسلام پر کاملاً ایمان لانے کی ضرورت ہے۔ اب رہا یہ سوال کہ اسلام کی نشاۃ ثانیہ ہو سکتی ہے

تو اس کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ اسلام بطور مذہب کے عالمگیر ہو جائے اور تمام دنیا پر اس کی دینی طاقت کا غلبہ

ہو دوسرا یہ کہ مسلمانوں کو کرہ ارضی پر اقتدار حاصل ہو۔ اس بارے میں میرا خیال یہ ہے کہ مسلمان ملکوں کی حکمران جماعت اسلام کے نام سے فائدہ اٹھاتی ہے۔ اسلام کے کام نہیں آتی اکثریت ان لوگوں کی ہے جو اسلام سے حقوق حاصل کرتے ہیں لیکن اسلام کے فرائض ادا نہیں کرتے۔ ان میں بیشتر وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ اسلام فعال قوت (Living force) نہیں رہا بعض ملحد بھی ہیں لیکن جو لوگ اسلام کو فعال قوت نہیں مانتے وہ یورپی کلیسا کی تقلید میں اسلام کو بطور مذہب الگ رکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک مذہب انسان کا پرائیویٹ مسئلہ ہے۔ جنہیں اسلام سے محض عقائد کی شیفتگی ہے۔ وہ اپنے افعال و اعمال کی سیاسی بوقلمونی سے گھبرا کر اسلام کو دل کی تسلی کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اصل میں یہ لوگ اپنے ذہنی انحطاط اور دماغی افلاس کے باعث مغرب سے مرعوب ہو کر فکری لحاظ سے شکست خوردہ ہیں۔ لیکن موروثی مذہب کو عاقبت کے خوف سے ترک کرنے کے لئے تیار نہیں دوسرا طبقہ شکست خوردگی اور مکمل سپردگی کی پیداوار ہے۔ یہ گروہ سب کچھ قربان کر کے اپنے آپ کو مغربی تہذیب کی بوقلمونیوں کے حوالے کر دینا چاہتا ہے۔ اس میں کچھ تو ملحد ہیں کچھ ملا سے باغی۔ نتیجہ ان کی بغاوت کا یہ ہے کہ اصل اسلام ہی سے منحرف ہو گئے ہیں تیسرا طبقہ روائتی یا رسمی مسلمانوں کا

ہے ۔ ان میں ایک گروہ '' ما مقیمان '' اور ''پکی روٹی'' پڑھے ہوئے مذہبی کھلاڑیوں کا ہے ۔ جن سے کوئی توقع ہی نہیں کی جا سکتی ، یہ ہر دور میں رہے ہیں اور ہر دور میں رہینگے ان سے علم کو رتی بھر فائدہ نہیں انہیں حکومتیں حسب منشا ڈھال لیتی ہیں ، اور یہ حکومتوں کی عوام دشمنی کے لئے مفید ہوتے ہیں ۔ اقتدار کو ان سے کبھی کوئی خطرہ نہیں رہا ۔ یہ بجائے خود مذہب کے لئے خطرہ ہیں ۔ چوتھا طبقہ اُن منکرین کا ہے جو مشرق و مغرب کے تیور شناس ہیں اس طبقہ کو مذہب کے حدود اور جدید علم کے مقتضیات کا پورا پورا علم ہے ۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ ان کی تحریک کب طاقت اختیار کرتی ہے تاہم یہ لوگ فکر و نظر کے میدانوں میں اسلام کے خدمتگذار ہیں ۔

ش ۔ آپ نے تجزیہ تو صحیح کیا ہے ، لیکن یہ نہیں بتایا کہ آپ کے نزدیک اسلام کی نشاہ ثانیہ کا امکان ہے یا نہیں ؟

س ۔ اصل میں یہ سوال مفکروں کے جواب دینے کا ہے ۔

ش ۔ تو آپ سیاستدان ہیں ؟

س ۔ (مسکراتے) ہوئے گویا تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ مفکر قوموں کے مستقبل پر سوچتے ہیں اور سیاستدان اپنے مستقبل پر

ش ۔ بات درست ہے لیکن میں یہ نہیں کہہ رہا میرا سوال آپ کی سیاست سے نہیں آپ کی بصیرت سے ہے ۔

س - مجھے اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا یقین ہے لیکن اسکی صورت پہلی صورتوں سے مختلف ہو گی ، روح اسلام کی ہو گی، لیکن سراپا نیا ہو گا ، مثلاً سائینس اور اسکے افکار صنعت اور اسکے آثار ، وقت زمین اور فاصلہ کی ہم اہنگی وغیرہ ـــــــ

یہی معاملہ بعض دوسرے علوم کا ہے۔ آپ روزمرہ دیکھ رہے ہیں کہ ریاضیات عمرانیات ، طبیعات ، نفسیات اور حیاتیات میں بسرعت تمام تبدیلیاں ہو رہی ہیں ، یہ زمانہ اونٹوں کا نہیں طیاروں کا ہے جب تک ہمارے مفکرین جنھیں میں علما اور فضلا کا مرکب سمجھتا ہوں اسلام کی روح کو انسان کی روح میں جدید عصری تقاضوں کی پشتیبانی کے ساتھ ڈھالیں گے نہیں ؟ اسلام کی نشاۃ ثانیہ میں تاخیر ہوتی رہیگی -

ش - نشاۃ ثانیہ کے لئے کتنی مدت چاہئے ؟

س - میں کوئی نجومی نہیں ؟ ضعیف الاعتقاد لوگ نجومیوں سے رجوع کرتے ہیں - جونہی مسلمانوں نے اسلام کے لئے انقلاب کی تیاری کرلی نشاۃ ثانیہ اس سرعت سے ہو گی کہ دنیا دنگ رہ جائیگی بلکہ جو لوگ اس نشاۃ ثانیہ سے مستفید ہو نگے وہ خود حیران ہونگے کہ یہ معجزہ کیونکر ظہور میں آگیا ؟

ایک مسلمان کی حیثیت سے ہمیں اسکے لئے جد و جہد کرنی چاہئے - نتجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہئے ہم اللہ کے اختیار میں ہیں اور وہی انسانوں کو انکی جد و جہد کا پھل دیتا ہے

اچانک ایک اور صاحب آ گئے جس سے سلسلہ کلام منقطع ہو گیا۔ کوئی خاص سوال بھی نہیں رہا تھا وہ صاحب کچھ دیر بیٹھ کر چلے گئے تو میں نے کہا۔

ش۔ تو آپ ان حالات میں بالکل مایوس ہیں ؟

س۔ بالکل مایوس نہیں ، لیکن مایوس ضرور ہوں ، میں نے رہا ہو کر عوامی لیگ کو بحال نہ کیا۔ کوشش یہ کی کہ سب جماعتیں مل کر ایک جماعت بن جائیں اور جمہوریت کی واپسی کے لئے مشترکہ جد و جہد کریں لیکن بیل منڈھے نہ چڑھی یہاں افراد کا اختلاف مقاصد کا اختلاف بن جاتا ہے

ش۔ تو پھر کیا ارادہ ہے؟

س۔ ارادہ یہ ہے کہ میڈیکل چیک اپ کراؤں اسکے بعد انگلستان چلا جاؤں ، اور وہاں کچھ روز کسی کلینک میں داخلہ لوں ، جیل خانے نے صحت کی دیواریں ہلا دی ہیں صحت واپس آ گئی تو پھر جد و جہد کروں گا۔ جد و جہد سے میں ہٹنے کا نہیں ، لیکن اس زمین کے لوگوں پر مجھے اعتبار نہیں رہا ؟

ش۔ آپ کب تک انگلستان جائیں گے ؟

س۔ میڈیکل چیک اپ کے بعد۔زرمبادلہ ملتے ہی چلا جاؤں گا میں نے واپس لاہور آنے کے لئے اجازت چاہی تو بغلگیر ہو گئے۔میرے دونوں گالوں پر پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا اچھا بھائی !خدا حافظ اس وقت کیا معلوم تھا کہ یہ آخری

ملاقات ہے پھر کبھی ملاقات نہ ہو گی ۔ اور وہ ہمیشہ کے لئے خدا حافظ کہہ رہے ہیں،لندن سے مجھے دو خط لکھے ، تسلی ہوئی کہ وہ رو بصحت ہیں ، پھر پھرتے پھراتے بیروت پہنچ گئے ، وہاں سے بھی دو خط لکھے ، انہیں معلوم تھا کہ بیروت کے حسن و جمال سے مجھے دل چسپی ہے۔ ایک روزاچانک خبر آگئی کہ حسین شہید سہروردی حرکت قلب بندہو جانے سے بیروت کے ایک ہوٹل میں انتقال کر گئے ہیں ، میں سکتہ میں آگیا ۔ تمام ملک میں افسوس کیا جا رہا تھا ، ع

مر گئے ہم تو زمانہ نے بہت یاد کیا ،

شائستہ اور شابدہ میری دو بچیوں نے سنا تو آبدیدہ ہو گئیں جب کبھی ادہر اُدہر سے آتے ان کے لئے ضرور کوئی کھلونا یا مٹھائی لاتے وہ ملک کے پہلے وزیر اعظم تھے جنہوں نے چین کا دورہ کیا انہی کے زمانہ میں چو این لائی پہلی دفعہ پاکستان آئے اورکشمیر کے متعلق پاکستان کے موقف کی حمایت کی ، بابا چین سے آتی دفعہ میری ان بچیوں کے لئے ریشم لائے تھے ، جاپان گئے تو وہاں سے بھی خوبصورت کپڑے لیکر آئے تھے ۔ ان کے لئے وہ سراپا شفقت تھے ۔

ان کا قومی عقیدہ تھا کہ ہمیں کسی ملک کے خلاف نہیں ہونا چاہیئے ۔ کیونکہ ہمارا ملک ابھی پسماندہ ہے ۔ جہاں تہاں سے اقتصادی امداد ملے قبول کر لینی چاہئے ۔ انکی رائے میں مغربی جمہوریت اسلامی روح کے ساتھ ہمارے لئے موزوں نظام تھا ۔ انہوں نے اپنے عہد وزرات میں نہ کوئی اخبار بند کیا ، اور نہ کسی آدمی کو سکیورٹی یا

سیفٹی ایکٹ کے تحت جیل میں ڈالا - وہ چاہتے تھے کہ جمہوریت کا انحصار جن چار ستونوں پر ہے وہ شکستہ نہ ہونے پائیں، آزادیٔ تحریر و تقریر ہو، عدلیہ میں مداخلت نہ ہو انتخاب وقت مقررہ پر ہوں اور بالغ رائے دہی کے اصول پر آزاد ہوں۔ لیکن انسان بہت سی اُمیدیں لے کر چلتا اور بہت سی آرزوئیں پالتا ہے سب کہاں پوری ہوتی ہیں - - - - -

ہے یہاں فرصت کردار نفس یک دو نفس
عوض یک دو نفس قبر کی شب ہائے دراز

سہروردی کشمکش اور جد و جہد کی ایک طویل زندگی گزار کر اللہ کو پیارے ہو گئے، انہیں زندگی میں کامیابی بھی ہوئی اور ناکامیابی بھی، وہ کچھ دنوں اور بھی جی سکتے تھے لیکن بعض ایسے سانحے ہوتے ہیں کہ شاعروں سے بھی ہم نوا ہونا پڑتا ہے -

اچھا ہوا کہ زندگی اک مختصر ملی
ورنہ اُمید و یاس کا قصہ دراز تھا

تاریخ سے ان کا نام محو نہیں ہو سکتا - وہ پاکستان کی تاریخ کا عنوان جلی تھے - انہوں نے ملک میں سب سے پہلے سیاسی حزب اختلاف کی بنیاد رکھی - جمہوریت کی نشو و نما کے لئے دو اور دو سے زائد سیاسی پارٹیوں کے وجود پر زور دیا - اُن کی یادیں لوک گیتوں کی طرح لوگوں کے دلوں میں ہیں اور ان کا تذکرہ لوک کہانیوں کی طرح زبانوں پر ہے - وقت کے ساتھ ان کی یاد اور بھی

روشن ہوتی جا رہی ہے -------ع

مجنوں جو مر گیا ہے تو جنگل اداس ہے

مغربی پاکستان کی بیداری کے لئے انہوں نے بہت سے جتن کئے لیکن مغربی پاکستان نے ان سے روشنی تو حاصل کی مگر چراغ گور سمجھ کر ان سے صرف نظر کیا ———

وہ لوگ تم نے ایک ہی شوخی میں کھو دئے

ڈھونڈا تھا آسمان نے جنہیں خاک چھان کے

پاکستان کا یہ عظیم انسان آج مشرقی پاکستان کے دارالحکومت ڈھاکہ میں ہمیشہ کی نیند سو رہا ہے -----ع

زدی ، کشتی ، شکستی سوختی ، انداختی . رفتی

بنگال دھان کے کھیتوں کی سر زمین ہے - بنگال ثقافت کا بلدہ ہے - بنگال ساز و آواز کا نگار خانہ ہے - بنگال شہنائی کے سروں سے تلوار کے نغمے ڈھالنے والوں کی رزم گہ ہے آج اس کی گود میں وہ شخص سو رہا ہے جو خود ایک زندگی تھا - لیکن اس کی زندگی کئی زندگیوں کا مجموعہ تھی - اس کے اُٹھ جانے سے سیر چشمی ، فیاضی ، فہم و ذکا ، تدبر و فراست اور سیاست و ذہانت کی ایک دنیا اُجڑ گئی - وہ آخری شخص تھا جو مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے درمیان سنگم بن سکتا تھا - اس میں ایک عظیم قائد کی صفات تھیں - پاکستان نے ان صفات سے فائدہ نہ اٹھایا نتیجۃً سیاسی دیواریں کھڑی ہوتی چلی جا رہی ہیں - وہ مخلوط

انتخاب کا بھی اس لئے حامی تھا کہ پاکستانی قومیت کا احساس پیدا ہو اور جو غیر مسلم یہاں بستے ہیں ان کے دماغوں میں اجنبی ہونے کا خطرناک احساس نہ رہے۔ لیکن اس کے الفاظ بیوہ کے آنسوؤں کی طرح بہہ گئے۔ آویزۂ گوش نہ ہو سکے۔ اس کے مطالب تقسیم ہو کر فضا میں تحلیل ہو گئے۔ اس کے افکار کو مختلف سیاسی خانوادوں نے مجروح کیا۔ جو اس کے زخموں سے کھیلتے رہے۔ وہ آخری دور میں مسلمانوں کی ناقدری کے باعث ——

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق
بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دین

کا مرقع تھا اب اس کی یادیں ہی یادیں رہ گئی ہیں یا پھر خفی و جلی تصویریں اور ان کا رنگ و روغن' یا نقش و نگار کہ دلوں پر نقش ہیں۔

رفتید ولے نہ از دل ما